قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر 1981

اس پرچہ میں :-

بنیادی حقوق انسانیت

اگلے پرچہ میں :-

ہماری تاریخ

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵- بی گلبرگ - ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان -/۳۶ روپے
غیر ممالک -/۸۶ روپے

ٹیلی فون نمبر
۸۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور ۱۱

قیمت فی پرچہ
۳
تین روپے

جلد ۳۴ | نومبر ۱۹۸۱ء | شمارہ ۱۱

فہرست

۱۔ لمعات ..... (نذرِ اقبالؒ) ---------- ۲
۲۔ باب المراسلات ---------- ۱۴
۳۔ بنیادی حقوقِ انسانیت اور قرآن --- (محترم پرویز صاحب) --- ۱۷
۴۔ ..... بنا کے تقدیر کا بہانہ! ---------- ۴۱
۵۔ حقائق و عبر — (اتباعِ سنّت) ---------- ۵۱
۶۔ "سلیم کے نام" ---------- ۵۴
۷۔ "تصوّف کی حقیقت" ---------- ۵۵
۸۔ قرآنی درس کے اعلانات ---------- ۵۶
۹۔ تحریکِ پاکستان کی کہانی — (طلوعِ اسلام کی زبانی) --- قسط سوم --- ۵۷

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر شیخ عبدالحمید مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور ۱۱ مطبوعہ۔ اشرف پرنٹنگ پریس۔ ۹ ایبک روڈ۔ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

اس سے پہلے ہمارے ہاں علامہ اقبالؒ کے یوم وفات کی تقریب اپریل میں منائی جاتی تھی۔ لیکن اب اس کے علاوہ ان کے یوم پیدائش کی تقریب بھی (نومبر میں) منائی جاتی ہے۔ اس نسبت سے طلوعِ اسلام کی نومبر کی اشاعت کے لمعات حضرت علامہ اقبالؒ کی تعلیم اور پیغامات کی نذر کئے جاتے ہیں۔

۱- قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں

عرشی صاحب کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ علامہ اقبالؒ سے پوچھا: "علاج از قرآن ذخیرۂ احادیث و روایات اور کتب فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے؟" انہوں نے فرمایا: "یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ کن ضروریات کے ماتحت وضع کی گئیں، لیکن نفسِ اسلام قرآن مجید میں بکمال و تمام آچکا ہے۔ خداوند تعالیٰ کا منشا دریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔"

(البیان، دسمبر ۱۹۲۹ء)

۲- احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کیا جائے

مجھ کو ان[1] کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ وہ شریعتِ محمدیہؐ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں۔ جس میں عبادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو۔ معاملات کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آجکل شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لئے مدت درکار ہے، ہاں دوسرے اسلامی ممالک میں اس کی ضرورت کا احساس ہر روز بڑھ رہا ہے۔ شیخ علی رزاق اور دوسرے علمائے مصر کے مباحث سے مولوی صاحب آگاہ ہوں گے۔ علیٰ ہذا القیاس ترکی میں بھی یہی مسائل زیرِ غور ہیں، اس پر ایک آدھ کتاب بھی تصنیف ہو چکی ہے۔ اس میں زیادہ تر زمانۂ حال کے مغربی اصولِ فقہ کو ملحوظ رکھ کے فقہ اسلامی پر بحث کی گئی ہے۔ ترکوں نے جو "جرح" اور "سٹیٹ"

---

[1] خواجہ احمد الدین صاحب (امرتسری مرحوم)

بین امتیاز کرکے ان کو الگ کر دیا ہے۔ اس کے نتائج نہایت دُور رس ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ افتراق اقوامِ اسلامی کے لئے باعثِ برکت ہوگا یا شقاوت۔ غرضکہ مولوی صاحب یا ان کے رفقاء کو جو کلام الٰہی اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ میں اور مجھ جیسے اور لوگ صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں۔ ایک مدت سے ہم یہ سُن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص موخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت تک مروج ہیں، ان پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوعِ انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصولِ فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کریگا، وہی اسلام کا "مجدد" ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں جنفی اس بات کے قائل کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرضکہ یہ وقت عملی کام کا ہے، کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہبِ اسلام گویا زمانہ کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ (مکتوب بنام صوفی غلام مصطفےٰ تبسم۔ محررہ ۴ ستمبر ۱۹۲۵ء)

۳۔ مُسلمانوں کا نصبُ العین

انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو، ایک لامتناہی سلسلہ ہے باہم آویزشوں کا، خونریزیوں کا، اور خانہ جنگیوں کا۔ کیا ان حالات میں عالمِ بشری میں ایک ایسی اُمت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر موسس ہو؟ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ توحیدِ الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسبِ منشاءِ الٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے۔ ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی تدبیر کا کرشمہ نہ سمجھئے، بلکہ یہ رحمت اللعالمین کی ایک شان ہے کہ اقوامِ بشری کو ان کے تمام خود ساختہ تفوقوں اور فضیلتوں سے پاک کرکے ایک ایسی امت کی تخلیق کی جائے جس کو امۃ مسلمۃ لک کہہ سکیں اور اس کے فکر و عمل پر شہداء علی الناس کا خدائی ارشاد صادق آسکے۔

(مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں۔ متعلقہ قومیت)

۴۔ اسلام رنگ و نسل و جغرافیہ سے بلند ہو کر انسانیت کو دعوت دیتا ہے

۱۔ اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدہ کا، جو نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں ہے، نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ دنیا آج کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ دراصل اسلام، بلکہ کائناتِ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسانی سے محبت رکھتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود و ملک پر ہے، دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے۔ اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کرکے اس عقیدہ کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور بہمدردِ نوعِ انسانی کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشوونما و ارتقاء ہے۔

یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بے حد محبت ہے لیکن مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے محض اس محبت کے پیش نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے، بلکہ دراصل عملی حیثیت سے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے، کیونکہ نہایہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے۔ مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کائنات انسانیت کے اتحاد عمومی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے اور کہتا ہے۔ تعالوا الیٰ کلمۃ سواء بیننا و بینکم۔

(ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب متعلقہ فلسفۂ سخت کوشی)

(۲)

اسلام کے مذکورہ بالا دعوے پر عقلی دلائل کے علاوہ تجربہ بھی شاہد ہے۔ اوّل یہ کہ اگر عالم بشریت کا مقصد اقوام انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظام اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آ سکتا، کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے، جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاریخ ادیان اس بات کی شاہد عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں "دین" قومی تھا، جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا، بعد میں نسلی قرار پایا، جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ عقائد کا نام ہے۔ اس واسطے انسان کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف اسٹیٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے، نہ نسلی، نہ انفرادی، نہ پرائیویٹ بلکہ خالصتہً انسانی ہے، اور اس کا مقصد، باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا دستور العمل قوم اور نسل پر بنا نہیں کیا جا سکتا، نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکتے ہیں، بلکہ اس کو صرف معتقدات پر مبنی کیا جا سکتا ہے، صرف یہی ایک طریق ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک امت کی تشکیل اور اس کے بقا کے لئے ضروری ہے۔ اس سے علیحدہ رہ کر جو اور راہ اختیار کی جائے وہ راہ لادینی کی ہوگی اور شرف انسانیت کے خلاف ہوگی۔ چنانچہ یورپ کا تجربہ دنیا کے سامنے ہے۔ جب یورپ کی دینی وحدت پارہ پارہ ہوگئی اور یورپ کی اقوام علیحدہ علیحدہ ہوگئیں تو ان کو اس بات کی فکر ہوئی کہ قومی زندگی کی اساس کیا قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ مسیحیت ایسی اساس نہ بن سکتی تھی۔ انہوں نے یہ اساس وطن کے تصور میں تلاش کی۔ کیا انجام ہوا اور ہو رہا ہے۔ ان کے اساس کے انتخاب کا نتیجہ لوتھر کی اصلاح، غیر مسلم عقلیت کا دور، اصول دین کا اسٹیٹ کے اصولوں سے افتراق بلکہ جنگ، یہ تمام قوتیں یورپ کو دھکیل کر کس کی طرف لے گئیں۔ لادینی، دہریت اور اقتصادی جنگوں کی طرف!

(مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں مضمون متعلقہ وطنیت)

(۳)

نبوت محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ہیئت اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے، جس کی تشکیل اس قانون الٰہی کے تابع ہو، جو نبوت محمدیہ کو بارگاہ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ بنی نوع انسان کی اقوام کو، باوجود شعوب و قبائل اور الوان و السنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے، ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے۔ جو زمان، مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکر خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہم کنار رہتا

ہے۔ یہ ہے مقامِ محمدیؐ، یہ ہے نصب العین ملتِ اسلامیہ کا۔ اس کی بلندیوں تک پہنچنے میں معلوم نہیں حضرتِ انسان کو کتنی صدیاں لگیں، مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اقوامِ عالم کی باہمی مغائرت دور کرنے اور باوجود شعوبی، قبائلی، نسلی، لونی اور لسانی امتیازات کے، ان کو ایک رنگ کرنے میں جو کام اسلام نے تیرہ سو سال میں کیا ہے وہ دیگر ادیان سے تین ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا۔ یقین جانئے کہ دینِ اسلام ایک پوشیدہ اور غیر محسوس حیاتی اور نفسیاتی عمل ہے جو بغیر کسی تبلیغی کوششوں کے بھی عالمِ انسانی کے فکر و عمل کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسے عمل کو حال کے سیاسی مفکرین کی جدت طرازیوں سے مسخ کرنا ظلمِ عظیم ہے بنی نوعِ انسان پر اور اس نبوت کی ہمہ گیری پر جس کے قلب و ضمیر سے اس کا آغاز ہوا۔

(مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں مضمون متعلقہ وطنیت)

۵۔ عالم گیر پیغام کے لئے بھی ایک سوسائٹی کی ضرورت ہوتی ہے

مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفہ کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالم گیر ہے لیکن باعتبار اطلاق، وانطباق مخصوص و محدود، ایک حیثیت سے ان کا ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصب العین شعر اور فلسفہ میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اگر اسے مؤثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں، تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطب اولین نہیں ٹھہرائیں گے اور ایسی ایک مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرۂ مخاطبت محدود کر دیں گے جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہِ عمل رکھتی ہو، لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔

(ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب۔ متعلقہ فلسفۂ سنت کوشی)

۶۔ مذہب نجی معاملہ نہیں

سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیش نظر ہے، اس کی صحیح حیثیت کیا ہے۔ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ ہے؟ اور آپ یہ چاہتے ہیں کہ اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں، لیکن اس کے نظامِ سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ ہندوستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ باعتبارِ آبادی ہم لوگ اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہبی واردات محض انفرادی اور ذاتی واردات ہیں، اہلِ مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا کہ وہ ایک مشربِ رہبانیت ہے جس نے دنیائے مادیات سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالمِ روحانیت پر جما لی ہے۔ اس قسم کے عقیدے سے لازماً وہی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وارداتِ مذہب کی حیثیت، جیسا کہ قرآن پاک میں ان کا اظہار ہوا ہے، اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہے کہ ان کا تعلق محض صاحبِ واردات کے اندرونِ ذات سے ہو، لیکن اس کے باہر اس کے گرد و پیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اولین نتیجہ سے ایک ایسے نظامِ سیادت کی تاسیس ہوئی جس کے اندر

قانونی تصورات مضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی بنیاد وحی پر ہے۔ لہٰذا اس کا مذہبی نصب العین اس معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے، الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کر دیا تو بالآخر دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا۔

(خطبۂ صدارت مسلم لیگ۔ ۱۹۳۰ء)

(۲)

یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو حقد اجتماعی کا پابند ہو۔ ریاستِ اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔ (ایضاً)

۷۔ اسلام اپنے اصولوں میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا

اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں، بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو، نامعقول و مردود ہے۔

(بجواب مولانا حسین احمد مدنی۔ متعلقہ قومیت)

(۲)

امتِ مسلمہ جس دین کی حامل ہے۔ اس کا نام دینِ قیم ہے۔ دینِ قیم کے الفاظ میں ایک عجیب و غریب لطیفۂ قرآنی مخفی ہے اور وہ یہ کہ صرف دین ہی متقوّم ہے۔ اس گروہ کے امورِ معاشی اور مادی کا جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اسکے نظام کے سپرد کر دے' بالفاظ دیگر قرآن کی رو سے حقیقی، تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم، دینِ اسلام ہی سے تقویم پاتی ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کوئی دستور العمل جو غیرِ اسلام ہو نامعقول و مردود ہے۔

(ایضاً)

۸۔ ملائیت، تصوّف، ملوکیّت

۱۔ ملائیت:۔ کبھی علمائے اسلام کے لئے ایک قوتِ عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں، لیکن صدیوں کے مرور کے بعد خاص کر زوالِ بغداد کے زمانہ سے وہ بے حد قدامت پرست بن گئے۔ اور آزادی اجتہاد (یعنی قانونی امور میں آزاد رائے قائم کرنا) کی مخالفت کرنے لگے۔ پس انیسویں صدی کے مصلحین اسلام کا پہلا مقصد یہ تھا کہ عقائد کی جدید تفسیر کی جائے اور بڑھتے ہوئے تجربہ کی روشنی میں قانون کی جدید تعبیر کرنے کی آزادی حاصل کی جائے۔

۲۔ تصوف:۔ مسلمانوں پر ایک ایسا تصوف مسلط تھا جس نے حقائق کی آنکھیں بند کر لی تھیں، جس نے عوام کی قوتِ عمل کو ضعیف کر دیا تھا اور ان کو ہر قسم کے توہم میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اور عوام کی جہالت اور ضعفِ اعتقادی سے

فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اس نے بتدریج اور غیر محسوس طریقہ پر مسلمانوں کی قوتِ ارادی کو کمزور اور اس قدر نرم کر دیا تھا کہ مسلمان اسلامی قانون کی سختی سے بچنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے مصلحین نے اس قسم کے تصوف کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ اور مسلمانوں کو عصرِ جدید کی روشنی کی طرف دعوت دی۔ یہ نہیں کہ یہ مصلحین مادہ پرست تھے، ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اسلام کی روح سے آشنا ہو جائیں، جو مادہ سے گریز کرنے کی بجائے اس کی تسخیر کی کوشش کرتی ہے۔

۳۔ ملوکیت: مسلمان سلاطین کی نظر اپنے خاندان کے مفاد پر بھی رہتی تھی اور اپنے اس مفاد کی حفاظت کے لئے اپنے ملک کو بیچنے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ سید جمال الدین افغانی کا مقصدِ خاص یہ تھا کہ مسلمانوں کو دنیائے اسلام کے ان حالات کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے۔ (ختمِ نبوت ـــــ بجواب پنڈت جواہر لال نہرو)

۹۔ پاکستان کی آزادی مسلمانوں کے جمود کو توڑ ڈالے گی

میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائیگا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔ (خطبۂ صدارت ۔ ۱۹۳۰ء)

۱۰۔ کمیونزم خلافِ اسلام ہے

سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیات کے مذہب کے مخالف ہیں اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں ـــــ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تاریخ سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا جس کی تشریح میں نے ان تحریروں میں جا بجا کی ہے اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی جو روحانیت میرے نزدیک مغضوب ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے، اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔ (مکتوب بنام غلام السیدین۔ محررہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

۱۱۔ یہی اسلام کی منزہ شکل ہے

لیگ کو آخر الامر یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ ایک ایسی جماعت رہنا چاہتی ہے جو صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی کرے یا وہ عوام کی نمائندگی کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت تک عوام نے لیگ میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اس کی ان کے پاس وجوہات ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی مرفع الحالی کا وعدہ نہیں دے سکتی، عوام کے لئے کبھی جاذبِ نگاہ نہیں بن سکے گی۔ (اس وقت حالت یہ ہے کہ) آئینِ جدید (یعنی ۱۹۳۵ء کے آئین) کے مطابق اعلیٰ ملازمتیں امراء کے بیٹوں کے حصے میں آجائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے وقف ہو جائیں گی (عوام اور متوسط درجہ کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہوگا)۔ یہ تو رہا ملازمتوں کی بابت۔ اسی طرح دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے

کبھی عوام کی مرفع الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گزشتہ دو سو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہو؟ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش فہمی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشو و نما دی جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش ضرور مل جاتا ہے۔

(مکتوب بنام قائداعظم محمد علی جناح۔ مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء)

دُرِ منثور

ان موتیوں میں سے چند ایک جو اقبالؒ کے مکتوبات و دیگر تحریراتِ نثر میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔

۱۔ داخلی انقلاب

زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔

(دیباچہ پیامِ مشرق)

۲۔ نسل پرستی

تاریخِ انسانیت میں اسلام کا ظہور ایسے وقت میں ہوا جب وحدتِ انسانیت کے لئے دو قانونی اصول، مثلاً خونی رشتے اور تخت و تاج کے علائق ناکام ہو رہے تھے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک وحدتِ انسانیت کا اصول گوشت پوست سے متعلق نہیں، بلکہ اس کا سرچشمہ انسانی قلب میں ہے۔ انسانیت کے نام اسلام کا عمرانی پیغام یہی ہے کہ نسلی امتیازات مٹا دو، ورنہ خانہ جنگی میں تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ کہنا مبالغہ آمیزی نہ ہوگا کہ اسلام فطرت کے نسل ساز مظاہر کو پسند نہیں کرتا اور اپنے مخصوص اداروں سے ایسے نقطۂ نگاہ کی تخلیق کرتا ہے جو فطرت کے نسل ساز قویٰ کو بے کار کر دے۔ انسانوں کے سدھارنے کے لئے اسلام نے ایک ہزار سال میں وہ کچھ کر دکھایا جو عیسائیت اور بدھ مت سے دو ہزار سال سے اوپر میں بھی نہیں ہو سکا۔

(احمدیت سے متعلق۔ نہرو کے جواب میں)

۳۔ مذہب اور سیاست

اسلام، محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے، جو اس کے قومی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ قدیم زمانے میں دین

قومی تھا جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندوؤں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی۔ نہ انفرادی ہے نہ پرائیویٹ۔ بلکہ خالصتہً انسانی ہے۔ اور اس کا مقصد، باوجود تمام فطری امتیازات کے، عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے، جو ایک اُمت کی تشکیل اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے۔

(مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں بیان)

۴۔ شریعت کا مقصود

اسلام نفسِ انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا، بلکہ ان کے عمل کے لئے حدود متعین کرتا ہے ان حدود کے معین کرنے کا نام اصطلاحِ اسلام میں شریعت یا قانونِ الٰہی ہے۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

۵۔ دورِ انحطاط کے پیشوا

اقوام و ملل کے عروج و زوال کی داستانوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوموں کی زندگی کی سوتیں خشک ہونا شروع ہوتی ہیں تو ان کا زوال بجائے خود ان کے شعراء فلاسفہ سیاسیین وغیرہم کو ایک نئی تحریکِ خیال سے ابھارتا ہے۔ چنانچہ وہ پیغمبرانہ شان سے اٹھتے ہیں اور استدلال کے گورکھ دھندے سے تیار کر کے حیاتِ ملی کے رذائل و ذمائم کے گیت گاتے اور انہیں خوش آئند و درخشاں بنا تے ہیں۔ یہ پیغمبر غیر شعوری طور پر قنوطیت کو رجائیت کے نگاہ فریب لباس میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اہلِ قوم کے عملی قویٰ کو شل، اور ان کی روحانی قوت نمو کو یکسر فنا کر دیتے ہیں۔ (بیان متعلقہ احمدیت)

۶۔ مجوسی کلچر

جب کسی کلچر میں علاماتِ زوال نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں تو اس کی فلسفیانہ بحثیں، اس کے تصورات اور اس کے واردات روحانی کی شکلیں جامد اور غیر متحرک ہو جاتی ہیں۔ مجوسی کلچر ایسے دور سے گزر رہی تھی کہ اسلام کا ظہور ہوا۔ جہاں تک میں تاریخ کلچر کا مطالعہ کر سکا ہوں، اسلام نے مجوسی کلچر کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ قرآن میں بیّن ثبوت اس امر کے ملتے ہیں کہ قرآن کا مقصد یہ تھا کہ وہ نہ صرف فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دے بلکہ واردات و کیفیاتِ روحانی کی تشکیلِ نو کرے۔ لیکن ہمارے مجوسی ورثہ نے اسلام کی زندگی کی سوتیں خشک کر دیں اور اس کی روح کی نشوونما اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے سلسلے کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

(احمدیت سے متعلق۔ اخبار لائٹ کے جواب میں)

۷۔ محاورۂ عرب

ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے، اور قرآن کی تفسیر میں محاورۂ عرب سے

بالکل کام نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معانی لئے جاتے ہیں جو عربی زبان میں ہرگز نہیں۔

(سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

۸۔ ملت کی حالت

اسلام کے لئے اس ملک میں نازک زمانہ آرہا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔ علماء میں مداہنت آگئی ہے۔ یہ گروہ حق کو کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیاء اسلام سے بے پرواہ اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آجکل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جذبہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں۔

(چودھری نیاز علی خاں کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

۹۔ اضطراب

میرے دل میں ممالک اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کر لے۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۲۶ء)

۱۰۔ فکر سے محرومی

قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔ (خطبۂ صدارت۔ ۱۹۳۲ء)

۱۱۔ لیڈروں کا فقدان

اس وقت (ہندوستان کے) مسلمان دو امراض میں مبتلا ہیں۔ پہلا مرض ان قائدین کا فقدان ہے، جو اسلام کی روح اور تقدیر کو بھی بخوبی سمجھتے ہوں، اور تاریخ جدید کے میلانات پر بھی ان کی نگاہ ہو۔ ایسے اشخاص ہی قوموں کی قوت متحرکہ ہوتے ہیں۔ لیکن وہ خدا کی دین ہوتے ہیں اور ضرورت کے مطابق پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ دوسرا مرض احساس اجتماعیت کا فقدان ہے اس سے افراد اور گروہ اپنی جداگانہ راہیں تلاش کر رہے ہیں اور عمومی فکر اور اجتماعی حرکت میں کوئی اضافہ نہیں کر رہے۔ اس وقت ہم سیاست میں وہ کچھ کر رہے ہیں جو مذہب میں صدیوں سے کرتے چلے آرہے ہیں۔

(خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

۱۲۔ احترام آدمیت

انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ (ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

۱۳۔ وحدتِ انسانیت

قومی وحدت ہرگز قائم و دائم نہیں ہے۔ وحدت صرف ایک معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو نسل، زبان، رنگ اور قومیت سے بالاتر ہے۔
(خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

۱۴۔ قومیت سے بلند

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالکِ مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید و تخلیق ہو، قابلِ احترام ہے۔
(دیباچہ پیامِ مشرق)

۱۵۔ وطنیت

میں یورپی تصورِ کی وطنیت کا مخالف ہوں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس سے مسلمانوں کو کم ترمادی فوائد حاصل ہونگے بلکہ اس لئے کہ اس میں منکرِ خدا مادیت کے جراثیم پائے جاتے ہیں جسے میں جدید انسانیت کے لئے عظیم ترین خطرہ سمجھتا ہوں۔
(خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء)

۱۶۔ مغربی سیاست

جن نام نہاد مدبرین کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سونپی گئی تھی، وہ خونریزی، سفاکی، استیلا اور ظلم کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاقِ انسانی کے نوامیسِ عالیہ کی حفاظت کریں، انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں، انہوں نے ملوکیت و استعمار کے جوش میں لاکھوں، کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پائمال کر ڈالا۔ صرف اس لئے کہ ان کے اپنے مخصوص ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچائے۔
(ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

۱۷۔ تاریک ترین دور

اس زمانہ ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور خدا جانے اور کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ اور ان نقابوں کے نیچے دنیا بھر کے تمام گوشوں میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔
(ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

۱۸۔ قوانینِ الٰہیہ کا اتباع

جب تک اقوام کی مجموعی قانونِ الٰہی کی پابند نہ ہو، امنِ عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔
(مولانا ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

۱۹۔ انحطاط کا جادو

انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے جس سے انحطاط کا مسحور اپنے قاتل کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔

(سراج الدین پال کے نام خط - ۱۹۱۶ء)

۲۰۔ ایرانی اثرات

ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام (یعنی خدا کے عطا کردہ دین) سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں۔ جس کی اشاعت رسول اللہ صلعم سے ہوئی۔

(منشی سراج الدین کے نام خط - ۱۹۱۵ء)

۲۱۔ تصوّف

تصوّف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانہ میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔ جس قوم میں توانائی مفقود ہو جائے، جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجبِ تسکین۔ اس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو جو ان کو تنازع للبقا میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔

(سراج الدین پال کے نام خط - ۱۹۱۶ء)

۲۲ تصوّف کا وجود سرزمینِ اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط - ۱۹۱۷ء)

۲۳ جب تصوّف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظامِ عالم کے حقائق، اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے، تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔

(علامہ اسلم جیراجپوری کے نام خط - ۱۹۱۹ء)

۲۴ ہندی اور ایرانی صوفیا میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفۂ وحدانیت (وحدت الوجود) اور بدھ مت کے زیرِ اثر کی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارۂ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہے۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط - ۱۹۳۶ء)

۲۵۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت (SUBTLE) طریقِ تنسیخ کا ہے۔ اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعرا ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث (وحدت) وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلانِ طبع موجود تھا۔ اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشو و نما نہ ہونے دیا، تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح ظاہر ہوا۔ یا بالفاظِ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شے کو مذموم بیان کیا ہے۔

(سراج الدین پال کے نام خط ۔ ۱۹۱۶ء)

۲۶۔ ابنِ عربی

تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے جس نے لمعات میں فصوص الحکم محی الدین ابنِ عربی کی تعلیموں کو نظم کیا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، فصوص میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں۔

(سراج الدین پال کے نام خط ۔ ۱۹۱۶ء)

۲۷۔ خوئے غلامی

جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو وہ ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے جس کا مقصد قوتِ نفس اور روحِ انسانی کا ترفع ہو۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط ۔ ۱۹۳۷ء)

۲۸۔ قرآن کا مسلک

اگر یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط ۔ ۱۹۳۲ء)

۲۹۔ شاعری

میرے نزدیک نظر حقائقِ اخلاقی و ملّی ہیں۔ زبان میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ فنِ شعر سے بھی بحیثیت فن کے نابلد ہوں۔

(پروفیسر شجاع کے نام خط ۔ ۱۹۳۱ء)

۳۰۔ شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدِنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط ۔ ۱۹۱۹ء)

باب المراسلات

سوال:۔ قرآنِ مجید میں حضرت نوحؑ کی کشتی کا ذکر ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ جُودی کی پہاڑی پر آکر رُک گئی تھی؟ یورپ کے مؤرخین اور محققین اکثر اس کی تلاش میں نکلتے رہتے ہیں اور مختلف قسم کی معلومات شائع کرتے رہتے ہیں، لیکن وہ ابھی تک یقینیات کا درجہ حاصل نہیں کر سکیں۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر ہونے کے تعلق سے یہ ہمارے ہاں کے مؤرخین اور مفسرین کا فریضہ تھا کہ اس کی بابت تحقیقات کرتے۔ کیا ہمارے مفسرین نے اس کی بابت کوئی تحقیق کی ہے، اور اگر کی ہے تو انہوں نے کیا معلومات بہم پہنچائی ہیں؟

جواب:۔ جی ہاں! ہمارے ہاں کے مفسرین نے اس کی بابت بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ تفسیر ابن کثیر بڑی قابلِ اعتماد تفسیر سمجھی جاتی ہے۔ اس میں اس کشتی کی بابت لکھا ہے کہ پہلے ایک سو سال اس کے لئے لکڑیاں کاٹ کر تختے بنانے میں لگ گئے اور پھر ایک سو سال کے عرصے میں یہ تیار ہوئی۔

اُس کا طول اسّی (۸۰) ہاتھ تھا اور عرض پچاس ہاتھ کا تھا۔ اندر باہر سے روغن کیا گیا تھا۔ پانی کاٹنے کے پَر پُرزے بھی تھے۔ قتادہؒ کا قول ہے کہ لمبائی تین سو ہاتھ کی تھی۔ ابن عباسؓ کا فرمان ہے کہ طول بارہ سو ہاتھ کا تھا اور چوڑائی چھ سو ہاتھ کی تھی۔ کہا گیا ہے کہ طول دو ہزار ہاتھ اور چوڑائی ایک سو ہاتھ کی تھی واللہ اعلم۔ اس کی اندرونی اونچائی تیس ہاتھ کی تھی۔ اس میں تین درجے تھے ہر درجہ دس ہاتھ اونچا تھا۔ سب سے نیچے کے حصّے میں چوپائے اور جنگلی جانور تھے۔ درمیان کے حصّے میں انسان تھے، اوپر کے حصّے میں پرندے تھے۔ دروازہ چوڑان میں تھا اوپر سے بالکل بند تھی۔ ابن جریر نے ایک غریب اثر عبداللہ بن عباسؓ سے ذکر کیا ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسےٰؑ بن مریم سے درخواست کی کہ اگر آپ بحکمِ خدا کسی ایسے مُردے کو جِلاتے جس نے کشتیٔ نوحؑ دیکھی ہو تو ہمیں اس سے معلومات حاصل ہوتیں — آپ انہیں لے کر چلے ایک ٹیلے پر پہنچ کر وہاں کی مٹی اٹھائی اور فرمایا جانتے ہو یہ کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول کو ہی علم ہے۔ آپؑ نے فرمایا۔ یہ پنڈلی ہے حام بن نوحؑ کی۔ پھر آپؑ نے اپنی لکڑی اس ٹیلے پر مار کر فرمایا۔ اللہ کے حکم سے اُٹھ کھڑا ہو۔ اُسی وقت ایک

بڈھا سا آدمی اپنے سر سے مٹی جھاڑتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ آپؑ نے اس سے پوچھا کہ کیا تو بڑھاپے میں مرا تھا؟ اس نے کہا نہیں مرا تو جوانی میں تھا لیکن اب دل پر دہشت بیٹھی کہ قیامت قائم ہوگئی۔ اس دہشت نے بوڑھا کر دیا۔ آپ نے فرمایا۔ اچھا! حضرت نوحؑ کی کشتی کی بابت اپنی معلومات بیان کرو۔ اس نے کہا کہ وہ بارہ سو ہاتھ لمبی اور چھ سو ہاتھ چوڑی تھی۔ تین درجوں کی تھی ایک میں جانور اور چوپائے تھے، دوسرے میں انسان، تیسرے میں پرند۔ جب جانوروں کا گوبر پھیل گیا تو اللہ تعالےٰ نے حضرت نوحؑ کی طرف وحی بھیجی کہ ہاتھی کی دُم ہلاؤ۔ اس کے ہلانے ہی اس سے خنزیر نر مادہ نکل آئے اور وہ میلا کھانے لگے۔ چوہوں نے جب اس کے تختے کُترنے شروع کئے تو حکم ہوا کہ شیر کی پیشانی پر انگلی لگا۔ اس سے بلی کا جوڑا نکلا اور چوہوں کی طرف لپکا۔ حضرت عیسےٰ علیہ السلام نے سوال کیا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو شہروں کے غرقاب ہونے کا علم کیسے ہوگیا؟ آپ نے فرمایا کہ انہوں نے کوّے کو خبر لینے کے لئے بھیجا لیکن وہ ایک لاش پر بیٹھ گیا دیر تک نہ آیا۔ آپ نے اس کے لئے ہمیشہ ڈرتے رہنے کی بددُعا کی۔ اس لئے وہ گھروں سے مانوس نہیں ہوتا۔ پھر آپ نے کبوتر کو بھیجا وہ اپنی چونچ میں زیتون کے درخت کا پتہ لے کر آیا اور اپنے پنجوں میں خشک مٹی لایا۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ شہر ڈوب چکے ہیں۔ آپ نے اس کی گردن میں حصرہ کا طوق ڈال دیا اور اس کے لئے امن و انس کی دعا کی۔ بس وہ گھروں میں رہتا سہتا ہے۔ حواریوں نے کہا کہ اے رسول اللہؑ! آپ انہیں ہمارے ہاں لے چلئے کہ ہم میں بیٹھ کر اور بھی باتیں ہمیں سنائیں۔ آپ نے فرمایا۔ یہ تمہارے ساتھ کیسے آسکتا ہے جبکہ اس کی روزی نہیں۔ پھر فرمایا اللہ کے حکم سے جیسا تھا ویسا ہی ہو جا وہ اُسی وقت مٹی ہوگیا۔

(حوالہ۔ تفسیر ابن کثیر بارھواں پارہ۔ صفحہ)

کشتی میں جو مخلوق سوار ہوئی تھی، اس کے متعلق بھی تفصیل دی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:۔

نوح علیہ السلام کو حکم خدا ہوا کہ اپنے ساتھ کشتی میں جاندار مخلوق کی ہر قسم کا ایک ایک جوڑا نر مادہ سوار کرا لو۔ کہا گیا ہے کہ غیر جاندار کے لئے بھی یہی حکم تھا۔ جیسے نباتات۔ کہا گیا ہے کہ پرندوں میں سب سے پہلے درہ کشتی میں آیا اور سب سے آخر گدھا سوار ہونے لگا۔ ابلیس اس کی دُم میں لٹک گیا۔ جب اس کے دو اگلے پاؤں کشتی میں آگئے اور اس نے اپنا پچھلا دھڑ اٹھانا چاہا تو نہ اُٹھ سکا کیونکہ دُم پر اس ملعون کا بوجھ تھا۔ حضرت نوحؑ جلدی کر رہے تھے۔ یہ بہتیرا چاہتا تھا مگر پچھلے پاؤں چڑھ نہیں سکتے تھے۔ آخر آپ نے فرمایا آجا گو تیرے ساتھ ابلیس بھی ہو۔ تب وہ چڑھ گیا اور ابلیس بھی اس کے ساتھ آیا۔ بعض سلف کہتے ہیں کہ شیر کو اپنے ساتھ لے جانا مشکل ہو پڑا۔ آخر اسے بخار چڑھ آیا تب اسے سوار کر لیا۔ ابن ابی حاتم کی حدیث میں ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ

وسلم فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جب تمام مویشی اپنی کشتی میں سوار کر لئے تو لوگوں نے کہا شیر کی موجودگی میں یہ مویشی کیسے آرام سے رہ سکیں گے؟ پس اللہ تعالےٰ نے اس پر بخار ڈال دیا۔ اس سے پہلے زمین پر یہ بیماری نہ تھی۔ پھر لوگوں نے چوہے کی شکایت کی کہ یہ ہمارا کھانا اور دیگر سب چیزیں خراب کر رہے ہیں تو خدا کے حکم سے شیر کی چھینک میں سے ایک بلی نکلی جس سے چوہے دبک کر کونے کھدرے میں بیٹھ رہے۔

(ایضاً - ص۱۱)

—(٠)—

یہ ہے اس تحقیق کا ماحصل جسے ہمارے مفسرین نے پیش کیا ہے۔ افسوس اس کا تو نہیں کہ انہوں نے اس قسم کی افسانہ تراشیاں کیوں کیں۔ رنج اور صدمہ اس بات کا ہے کہ یہ حضرات ان چیزوں کو منسوب کر دیتے ہیں حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی کی طرف۔ اس سے دنیا کی نگاہوں میں حضورؐ کا جس قسم کا تصوّر قائم ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔

لیکن مصیبت یہ ہے کہ جو شخص اس قسم کی روایات پر تنقید کرے، اس پر منکرِ حدیث کا لیبل چسپاں کر کے اسے دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ اب تک یہ تفاسیر دار العلوموں تک محدود تھیں، اب انہیں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی داخل کیا جا رہا ہے، کیونکہ اب تعلیم کو اسلامی بنانا مقصود ہے۔

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقلِ انسانی، زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے تک کے مفکرین، مؤرخین اور سائنس دانوں نے کیا دیا ہے۔ اس کتاب سے یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ عقلِ انسانی کو وحی کی روشنی کی ضرورت کیوں ہے؟

یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دے گی۔ کتاب نہایت خوبصورت ٹائپ میں سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔ قیمت۔ مجلد -/۴۰ روپے

کتاب التقدیر

انسان کی قسمت خدا کی مشیت اور غریب کی تقدیر سے کیا مفہوم ہے؟ کیا موت کا دن مقرر ہے؟ بعض بچے پیدائشی اپاہج کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ دعا کیا ہے اور کیا اس سے تقدیر بدل جاتی ہے؟ اس قسم کے بےشمار سوالات، ان کا جائزہ اور قرآن کریم کی روشنی میں ان کا حل آپ کو اس کتاب میں ملے گا۔ کتاب بڑے سائز کے چار سو سے زاید صفحات پر مشتمل ہے اور عمدہ سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔

جلد مضبوط (نقش ثانی)

قیمت -/۳۵ روپے

نوٹ:- ان قیمتوں میں محصول ڈاک شامل نہیں

ملنے کا پتہ (۱) مکتبہ دین و دانش اُردو بازار لاہور (۲) ادارہ طلوع اسلام - ۲۵/ بی - گلبرگ ۲ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

بنیادی حقوقِ انسانیت

اور

قرآن

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بنیادی حقوقِ انسانیت
اور
قرآن

پرویز

علمائے حیاتیات اور علم النفس اس پر متفق ہیں کہ تحفظ (SELF PRESERVATION) کا جذبہ ہر ذی حیات میں، جبلی طور پر پایا جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ جبلی جذبات میں اسے بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسی جذبہ کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی ہر متاعِ عزیز کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ جب انسانوں نے مل جل کر تمدنی زندگی بسر کرنی شروع کی، تو ان کے مفاد میں تصادم ہونے لگا۔ اس سے انہوں نے محسوس کیا کہ انفرادی زندگی بسر کرنے سے، ان کی وہ چیزیں محفوظ نہیں رہ سکتیں جنہیں وہ اپنی متاعِ عزیز اور سرمایۂ گراں بہا سمجھتے ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے..... اجتماعی نظم و نسق کا تصور وضع کیا، جسے اب حکومت کہا جاتا ہے۔ اس نظمِ اجتماعی کا مقصدِ اوّلین یہ تھا کہ افراد کی وہ چیزیں محفوظ رہیں جنہیں وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔

حکومت کی بنیاد تو اس مقصد کے تحت رکھی گئی تھی لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ تلخ حقیقت سامنے آگئی کہ حکمران طبقہ کے ہاتھوں لوگوں کا کوئی حق بھی محفوظ نہیں رہا۔ اس طبقہ نے تقسیم یوں کی کہ حقوق سب کے سب، ارباب حکومت کے ہیں۔ اور ذمہ داریاں تمام کی تمام رعایا کی۔ لوگ اس تقسیم کو گوارا نہ کرتے لیکن مذہبی پیشوائیت آگے بڑھی اور یہ کہہ کر عوام کو اس تقسیم کے سامنے جھکا دیا کہ راجہ

حقوق طبقۂ حکمران کے

ایشور کا اوتار ہوتا ہے۔ بادشاہ خدائی حقوق (DIVINE-RIGHTS) کا حامل ہوتا ہے۔ سلطان زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے، اس لئے فرماں روائی اس کا حق اور اطاعت گزاری تمہارا فریضہ ہے۔ وہ جو کچھ تمہیں دے، اس کی عنایت اور احسان ہے۔ تم اس سے بطور حق کچھ نہیں مانگ سکتے۔ تم اس کے حضور جھکو۔ اُسے سجدے

کرو۔ اس کی خیریت کی دعائیں مانگو۔ اُس کے ہر حکم کی اطاعت کرو، اور اس اطاعت کو اپنے لئے سرمایۂ ہزار سعادت سمجھو۔ تم اور جو کچھ تمہارا ہے، وہ اُس سب کا مالک ہے۔ اسے ان تمام چیزوں پر کلّی اختیار حاصل ہے۔ وہ تمہارا اَن داتا (رازق) اور پالن ہار (پروردگار) ہے۔ تم اس سے خیرات مانگ سکتے ہو۔ کوئی شے بطورِ حق کے طلب نہیں کر سکتے۔

حاکم اور محکوم کے باہمی تعلق کا یہ تصوّر اسی طرح چلا آرہا تھا کہ سترھویں صدی عیسوی میں یورپ کے سیاسی نظریات میں ایک انقلاب آیا جس کی رُو سے، اس تعلق کو از سرِ نو متعین کرنے کی کوشش کی گئی۔ کہا یہ گیا ہے کہ ان دونوں (فریقوں) کا تعلق، ایک معاہدہ کی رُو سے متعین ہونا چاہیئے۔ اسے نظریۂ میثاق (CONTRACT-THEORY) کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ

(۱) تمدنی زندگی بسر کرنے سے پہلے انسان فطری حالت پر تھا۔

(۲) اس فطری حالت میں انسان کچھ حقوق رکھتا تھا جنہیں ہنوز کسی نے غصب نہیں کیا تھا۔

(۳) جب انسان کو اپنے فطری حقوق کے تحفّظ کے لئے خطرہ لاحق ہوا تو اس نے معاشرتی زندگی اختیار کی۔ لہٰذا، معاشرہ (سوسائٹی) کا وجود، انسان کے فطری حقوق کے تحفّظ کے جذبہ کا رہین منّت ہے۔

مغربی مفکّرین کے نظریات

(۴) بنابریں، معاشرہ کا فریضہ ہے کہ انسان کے فطری حقوق کا تحفّظ کرے۔

(۵) ان فطری حقوق کا نام ہے۔ "بنیادی حقوقِ انسانیت"۔

اس نظریہ کا اوّلین داعی، یورپ کا مشہور مفکّر ہابس (HOBBES, 1588-1679) تھا۔ وہ کہتا ہے کہ "اپنے حکم کو دوسروں سے منوانا، انسان کی فطرت میں داخل ہے"۔ لیکن، اس کے ساتھ ہی "قیامِ امن" بھی انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ لیکن یہ دونوں باتیں یک جا نہیں رہ سکتیں جب کہ فرد، اپنا حکم دوسروں سے منوانے پر تل جائے تو امن کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ لہٰذا، انسان کو، اس دوسرے مقصد کے حصول کے لئے اپنے پہلے حق سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ بنابریں، ہابس کے نزدیک، قیامِ امن انسان واحد بنیادی حق ہے جس کے لئے وہ اپنے ہر دیگر حقوق سے دستکش ہو جاتا ہے۔

نظریۂ میثاق کا دوسرا علمبردار لاک (LOCKE, 1632-1704) ہے۔ اس کے نزدیک انسان کے بنیادی حقوق "زندگی۔ صحت۔ آزادی۔ اور املاک" ہیں۔ ان کے تحفّظ کے لئے انسان صرف اپنا ایک حق چھوڑتا ہے، اور وہ ہے، متنازعہ فیہ معاملات میں خود فیصلہ کرنے کا حق۔ لاک کہتا ہے کہ افراد کو چاہیئے کہ اپنے اس حق کو معاشرہ کے سپرد کر دیں، اور اس کے بعد معاشرہ کا فریضہ ہے کہ وہ افراد کے دیگر حقوق کا تحفّظ کرے۔

چونکہ ہابس اور لاک کے ہاں، بنیادی حقوق کا تصوّر ان کے نظریۂ میثاق کی ایک ذیلی شق کے طور پر آتا ہے، اس لئے یہ (تصوّر) کچھ ایسا واضح اور متعین نہیں۔ اسے، ایک جداگانہ اور مستقل

نظریہ کی حیثیت سے (TOM-PAINE ، 1739 — 1809) نے پیش کیا۔ جس کی کتاب۔ (RIGHTS OF MAN) آج بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ اس نے "زندگی۔ آزادی۔ املاک۔ حفاظت اور استبداد کی روک تھام" کو بنیادی حقوقِ انسانیت قرار دیا ہے۔ یہی تھے وہ حقوق، جنہیں، انقلابِ فرانس کے بعد، فرانس کی نیشنل اسمبلی نے اپنے چارٹر میں درج کیا تھا۔ امریکہ کا منشورِ آزادی (۱۷۷۶ء) بھی، پین ہی کے فطری حقوق کے نظریہ پر مبنی تھا۔ اس میں زندگی اور آزادی کے ساتھ "حصولِ مسرت" کو بھی بنیادی حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں روس کی کانگریس نے مزدوروں اور کسانوں کے سلسلہ میں بنیادی حقوق کا ایک منشور مرتب کیا جس میں کہا گیا کہ "اس منشور سے مقصود یہ ہے کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کو لوٹ نہ سکے۔ معاشرہ کی طبقاتی تقسیم کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے اور تمام دنیا میں معاشرہ کی تشکیل، اشتراکی خطوط پر کی جائے۔"

مجلسِ اقوامِ متحدہ

کوئی چالیس سال ادھر کی بات ہے، مجلس اقوامِ متحدہ (U.N.O) نے (HUMAN RIGHTS COMMISSION) کے نام سے ایک تحقیقاتی بورڈ مقرر کیا تھا کہ وہ کامل غور و خوض کے بعد، سفارشات کرے کہ انسانیت کے بنیادی حقوق کیا ہیں۔ ان سفارشات کو (U.N.O) نے جانچا اور پرکھا اور اس کے بعد ۱۹۴۸ء میں وہ چارٹر شائع کیا جسے "منشورِ حقوقِ انسانیت" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کی اس کوشش کو، اس وقت تک، اس باب میں حرفِ آخر سمجھا جاتا ہے۔ جو حقوق اس چارٹر میں درج ہیں، وہ مختصر الفاظ میں حسبِ ذیل ہیں:-

(۱) تمام انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں اور بنیادی حقوق کے یکساں حقدار ہیں۔
(۲) زندگی۔ آزادی اور حفاظتِ جان کا حق۔
(۳) غلامی کی ممانعت۔
(۴) بے رحمی کے سلوک سے حفاظت کا حق۔
(۵) قانون کے معاملہ میں یکساں سلوک کا حق۔
(۶) کسی شخص کو بلا قصور گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ نہ نظر بند یا جلاوطن کیا جائے گا۔
(۷) جب تک الزام ثابت نہ ہو، ملزم کو بے قصور تصور کئے جانے کا حق۔
(۸) معاملاتِ زندگی اور خط و کتابت میں عدمِ مداخلت کا حق۔
(۹) نقل و حرکت کی آزادی۔
(۱۰) ایک ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا بسنے کی آزادی۔
(۱۱) حقِ قومیت۔
(۱۲) شادی کا حق۔
(۱۳) حقوقِ جائیداد۔

(۱۴) خیالات، ضمیر اور مذہب کی آزادی۔ نیز اظہارِ خیالات اور اجتماعات میں شرکت کی آزادی۔
(۱۵) اپنے ملک کی حکومت میں شرکت کا حق۔
(۱۶) تعمیرِ خویش کے لئے وسائل و ذرائع کی آزادی۔
(۱۷) حسبِ منشاء کام کاج کی آزادی۔
(۱۸) آرام اور فرصت کی آزادی۔ نیز معیارِ زندگی اور تعلیم کا حق۔
(۱۹) جماعتی اور ثقافتی زندگی میں شرکت کا حق۔

یہ ہے مختصراً ان حقوق کی فہرست جسے اقوامِ عالم کے نمائندگان نے اپنے ... مسلّمہ چارٹر میں داخل کر رکھا ہے۔ ان حقوق سے کن شرائط کے تحت بہرہ یاب ہوا جا سکتا ہے۔ اس کے متعلق ذرا آگے چل کر ذکر کیا جائے گا۔ سرِدست اتنا اضافہ کافی ہوگا کہ اس فہرست کے بعد، چارٹر میں یہ تحریر ہے کہ ان حقوق، اور اختیارات کو ان حدود کے تابع استعمال کیا جا سکتا ہے جو، مختلف ممالک میں از روئے قانون عائد کی جائیں ——— چونکہ، اپنی اپنی منشاء کے مطابق قوانین سازی کا حق ہر ملک کو حاصل ہے، اس لئے ان قوانین کے تابع، "بنیادی حقوقِ انسانیت" کی جو حیثیت رہ جاتی ہے، وہ ظاہر ہے ———

یہ ہے، اجمالی سا تذکرہ ان کوششوں کا جو انسان کے بنیادی حقوق متعین اور تسلیم کرنے کے سلسلہ میں، انسانی فکر نے آج تک کی ہیں۔ اب ان کے مقابلہ میں اِس ضابطۂ حقوق کو سامنے لائیے جو

قرآن کا اعلان

چھٹی صدی عیسوی میں ——— جب دنیا، انسان کے بنیادی حقوق کے تصوّر تک سے ناآشنا تھی ——— تمام نوعِ انسان کی راہ نمائی کے لئے خدا کی طرف سے دیا گیا، اور جس پر عمل کر کے اس ضابطۂ آسمانی کے لانے والے، پیغمبرِ آخر الزمانؐ نے، دنیا کو پہلی بار اس حقیقتِ کبریٰ سے روشناس کرایا کہ دنیا میں انسان کا مقام کیا ہے اور اس کے وہ حقوق کیا جنہیں دنیا کی کوئی طاقت چھین نہیں سکتی۔ ان حقوق کا تفصیلی تذکرہ، اس مختصر سے وقت میں مشکل ہے، اس لئے میں اُن کے اجمالی تعارف پر ہی اکتفا کروں گا۔

وَمَا تَوْفِيقِيْ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

اس مقام پر سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسانی فطرت (HUMAN NATURE) کا تصوّر ہی غلط ہے۔ انسان کی کوئی فطرت نہیں۔ فطرت سے مراد ہوتی ہیں کسی چیز کی وہ خصوصیات جو اس شے کے اندر مضمر ہوں اور جنہیں نہ اسے بدلنے کا اختیار ہو اور نہ ہی ان کی خلاف ورزی کی مقدرت۔ (مثلاً) حرارت پہچانا آگ کی فطرت ہے۔ نشیب کی طرف بہنا پانی کی فطرت ہے۔ وہ نہ انہیں بدل سکتی ہیں۔ نہ ہی ان کی خلاف ورزی کر سکتیں۔ ان کے برعکس انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے اس لئے اس کی کوئی فطرت ہو نہیں سکتی۔ حیوانات کے کچھ طبعی تقاضے ہوتے ہیں، جنہیں ... (INSTINCTS) یا جبلّت کہا جاتا ہے۔ (یعنی وہ تقاضے جو جبل۔ پہاڑ کی طرح اپنے مقام پر اٹل اور محکم ہوں۔) یہی تقاضے انسان کی طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE) کے بھی ہیں۔

لیکن یہ ان کی خلاف ورزی بھی کر سکتا ہے۔ مثلاً اپنی زندگی کی حفاظت کرنا، ہر ذی حیات کا جبلّی تقاضا ہے جس کی خلاف ورزی کوئی حیوان نہیں کرتا۔ لیکن انسان خودکشی بھی کر سکتا ہے۔ بنا بریں، انسان کے فطری حقوق کا تصوّر غلط ہے۔ چنانچہ اب مغرب کے مفکّرین بھی اس حقیقت کو تسلیم کئے جا رہے ہیں کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں، حیوانات کی طرح اس کی طبیعی زندگی کے کچھ تقاضے ہیں۔

حیوانات کے تقاضے تو ان کی طبیعی زندگی کے تقاضوں تک محدود ہیں۔ لیکن انسان کے تقاضے اس کے طبیعی تقاضوں سے ماورا بھی ہیں۔ مثلاً عزتِ نفس (SELF RESPECT) کا تقاضا۔ ظاہر ہے کہ اس کا تعلق طبیعی زندگی سے نہیں، اس لئے حیوانات کو اس کا شعور تک نہیں ہوتا۔ یہ خالص انسانی تقاضا ہے۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ انسانی حقوق کا تعلق انسان کی طبیعی زندگی کے تقاضوں سے بھی ہوگا اور اس کی انسانی زندگی سے بھی۔ جہاں تک اس کی طبیعی زندگی کے تقاضوں کا تعلق ہے، ان کا معلوم اور متعیّن کرنا کچھ مشکل نہیں۔ ان کا ہر انسان کو خود علم ہوتا ہے۔ لیکن انسانی تقاضوں کی یہ کیفیت نہیں۔ یہ نہ جبلت کی طرح) انسان کے اندر ہوتے ہیں، اور نہ ہی متعیّن۔ (مثلاً) جنسی اختلاط کا تقاضا طبیعی زندگی سے متعلق ہے۔ اس کا ہر ایک کو علم ہوتا ہے۔ لیکن عصمت کی حفاظت کے تقاضے کی یہ کیفیت نہیں۔ عصمت کا تصوّر مختلف اقوام میں مختلف ہے۔ یہ وجہ ہے جو انسانی فکر کی رُو سے بنیادی حقوقِ انسانیت کا کوئی عالمگیر چارٹر مرتب نہیں ہو سکتا۔ اور اسی لئے اقوامِ متحدہ (U.N.O) کو ایک ماڈل چارٹر مرتب کرنے کے ساتھ ہی یہ کہنا پڑا کہ اس پر عمل، ہر ملک اپنے اپنے قوانین کے تابع کرے گا۔

قرآن کریم تمام انسانوں کے لئے (عالم گیر ضابطۂ زندگی ہے اس لئے وہ بنیادی حقوقِ انسانیت کا ایسا منشور دیتا ہے جس میں انسان کی طبیعی زندگی کے تقاضے بھی شامل ہیں اور اس کی انسانی زندگی کے تقاضے بھی جنہیں وحی کی رُو سے متعیّن کیا گیا ہے اس کا اطلاق ان تمام اقوام پر یکساں ہوگا جو قرآن پر ایمان رکھتی ہوں۔ اس اعتبار سے یہ غیر متبدّل۔ ابدی اور عالم گیر ہے۔

ان تمہیدی تصریحات کے بعد آگے بڑھئے۔

(۰)

قرآنی نظریۂ میثاق

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ نظریۂ میثاق، جسے عصرِ حاضر کی سیاسی فکر کا معرکہ آرا کارنامہ قرار دیا جاتا ہے، کا تصوّر بھی قرآن کریم ہی نے پیش کیا تھا۔ لیکن وہ اس میثاق کو، حاکم اور محکوم میں استوار نہیں کرتا ——— اس کے نزدیک انسانوں میں حاکم اور محکوم کا تصوّر ہی باطل ہے۔ جیسا کہ ذرا آگے چل کر بیان کیا جائے گا، اس کی رُو سے، کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ وہ اس میثاق کو خدا اور بندوں کے درمیان معاہدہ قرار دیتا ہے۔ لیکن اس میثاق کے لئے خدا خود بندوں کے سامنے نہیں آتا، اس لئے یہ

میثاق افراد، اور اس معاشرہ کے درمیان طے پاتا ہے جو نظامِ خداوندی کو متشکل کرنے کے لئے وجود میں آتا ہے۔ اسے خلافت یا قرآنی مملکت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ میثاق کے الفاظ یہ ہیں:-

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط... (۹/۱۱۱)

افرادِ معاشرہ (مومنین) اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ دنیا میں نظامِ عدل و احسان کے قیام اور استحکام کی خاطر ان کا مال اور ان کی جان، نظامِ خداوندی کے سپرد ہوں گے۔ اور نظامِ خداوندی ان سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ انہیں، اس کے عوض "الجنۃ" عطا کرے گا۔ اس دنیا میں بھی جنّت کی زندگی اور اُخروی زندگی میں بھی جنّت۔ جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے الجنۃ میں وہ تمام خوش حالیاں اور خوش گواریاں — سرفرازیاں اور سربلندیاں۔ اطمینان اور سکون۔ امن اور سلامتی۔ غرضیکہ وہ سب کچھ آجاتا ہے جس کی انسان آرزو کر سکتا ہے۔ اس میثاق کی رُو سے، ان تمام چیزوں کا حصول، ان لوگوں کا بنیادی حق ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے جنتی معاشرہ کی جو تفاصیل بیان کی ہیں، اگر میں ان کا ذکر کروں تو اس سے ایک ایسی جامع فہرست مرتب ہو جائے گی جسے ان افرادِ معاشرہ کے بنیادی حقوق کا چارٹر سمجھا جائے گا۔ لیکن میں اِس وقت، اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ اس لئے کہ یہ حقوق ان لوگوں کے ہوں گے جو اس میثاقِ خداوندی کا ایک فریق ہوں گے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اور میرا موضوع، اُن حقوق سے متعلق ہے جو قرآن کی رُو سے دُنیا کے ہر انسان کو، محض انسان ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں۔ یہ حقوق، کسی معاہدہ یا میثاق سے مشروط نہیں ہوں گے۔ نہ کسی خدمت کا معاوضہ۔ یہ بلا مشروط ہوں گے اور بلا مشروط معاوضہ، ہر انسان کو ——— بلا تخصیصِ مذہب، ملّت، زبان، رنگ، نسل، وطن، محض انسان ہونے کی جہت سے حاصل ہوں گے۔ دیکھئے یہ حقوق کیا ہیں، جنہیں ہر انسان قرآنی معاشرہ سے طلب کر سکتا ہے۔

قرآنی حقوقِ انسانیت

(۱) احترامِ آدمیّت

پہلا حق یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ، پیدائش کے اعتبار سے یکساں طور پر عزّت کا مستحق ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ..... (۱۷/۷۰) قرآن کا ارشاد ہے۔ یعنی "ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم پیدا کیا ہے"۔ لہٰذا، پیدائش (حسب، نسب، ذات، برادری وغیرہ) کے اعتبار سے انسان اور انسان میں فرق۔ امارت اور غربت کے لحاظ سے انسانوں میں تمیز۔ کسب و ہنر اور پیشوں کے اعتبار سے انسانوں میں تفریق اس پیدائشی حق کے خلاف ہے۔ مختصر الفاظ میں، انسان کی تذلیل، خواہ کسی جہت سے ہو، اس حق کی خلاف ورزی ہے۔ "آدمیت، احترامِ آدمی"، قرآن کا پہلا اصول ہے۔ اور ہر انسان کا اوّلین بنیادی حق، بلا مشروط

(۲) جنسی مساوات

قرآن کریم کی رُو سے جنسی تفریق نہ وجہِ ذلت ہے نہ باعثِ امتیاز۔ یعنی نہ مرد، محض مرد ہونے کی حیثیت سے، عورتوں سے افضل ہیں، اور نہ ہی عورتیں، محض عورت ہونے کی بنا پر، مردوں سے کہتر۔ زندگی کی ابتدا، نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے (خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ..... (۴/۱) قرآن کا ارشاد ہے۔ ہر انسانی بچہ میں ـــــ خواہ لڑکا ہو یا لڑکی ـــــ کچھ حصہ مرد کا ہوتا ہے اور کچھ حصہ عورت کا ـــ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى ..... (۴۹/۱۳) اس لئے نہ مرد، عورتوں سے الگ کوئی نوع ہیں، نہ عورتیں، مردوں سے الگ کوئی جنس۔ دونوں نوعِ انسان کے افراد ہیں، اور جس مقام کا مستحق ایک انسان ہے، اس میں مرد اور عورت دونوں یکساں طور پر شریک ہوتے ہیں۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے دروازے ایک صنف کے لئے کھلے رکھیں جائیں، اور دوسری پر بند کر دیئے جائیں۔ حیاتیاتی طور پر ..... (BIOLOGICALLY) مرد اور عورت کی ساخت میں جو فرق ہے اس کا تعلق ان کے طبعی وظائف حیات سے ہے۔ انسانیت کی سطح پر دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس میں عمل کا میدان دونوں کے لئے یکساں ہے، اور اعمال کے نتائج بھی یکساں، لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ج بَعْضُكُمْ مِّنْ م بَعْضٍ ج ..... (۳/۱۹۴) تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کا اجر ضائع نہیں ہو سکتا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت ـــــ مرد اور عورت کی تخصیص کے معنی کیا؟ تم ایک دوسرے کے اجزا ہو۔ تم خلقت کے اعتبار سے ایک ہو ـــ زندگی کے تمام معاملات میں یکساں طور پر شریک رہتے ہو۔ تم ایک نوع کے فرد ہو۔ پھر آیات (۳۳/۳۵) و (۹/۷۱) میں دیکھئے۔ قرآن کریم کس طرح مردوں اور عورتوں کو زندگی کے ہر میدان میں دوش بدوش گامزن بناتا ہے۔

لہٰذا، جنسی مساوات، انسانیت کا بنیادی حق ہے جسے کسی صورت میں بھی غصب نہیں کیا جا سکتا۔ قرآنی معاشرہ اس حق کو برقرار رکھنے کا ذمہ دار ہے۔

(۳) مدارج علیٰ قدرِ اعمال

احترامِ آدمیت کے بعد، معاشرہ میں مختلف افراد کے مدارج کا سوال سامنے آتا ہے اس کے لئے اصول یہ ہے کہ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ..... (۴۶/۱۹)۔ ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ، اس کے اعمال و کردار کے مطابق متعین کیا جائے گا۔ یعنی سب سے پہلے ہر انسان کی عزت بحیثیتِ انسان ہوگی، اور اس کے بعد اس کے جوہرِ ذاتی اور حسنِ سیرت و کردار کو دیکھا جائے گا، اور ان کے مطابق سوسائٹی میں اس کا مقام اور درجہ مقرر کیا جائے گا۔ جو جتنی زیادہ خوبیوں کا مالک، وہ اتنے ہی اونچے مقام کا مستحق۔ حتّٰی کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ..... (۴۹/۱۳) جو سب سے زیادہ حسنِ عمل کا پیکر، وہ سب سے زیادہ واجب العزت۔ نیچے سے لے کر اوپر تک، عزت کا ہر مقام ہر شخص کے لئے کھلا ہوگا، جسے وہ اپنی قابلیت اور حسنِ سیرت

کی رُو سے بطورِ حق حاصل کر سکے گا۔ اس کا یہ حق اس سے کوئی نہیں چھین سکتا، نہ ہی تعیینِ مدارج کا کوئی اور معیار مقرر کیا جا سکتا ہے۔

(۴) حقِ آزادی

"آزادی ہر شخص کا پیدائشی حق ہے"۔ یہ نعرہ اور اعلان تو آپ نے ہر جگہ سے بلند ہوتا سنا ہوگا لیکن اس کا صحیح مفہوم بہت کم سامنے آیا ہوگا۔ جس جگہ سے آپ نے یہ نعرہ بلند ہوتے دیکھا ہوگا، وہیں سے آپ نے آئے دن ایسے احکام نافذ ہوتے بھی دیکھے ہوں گے جو ہر شخص کی آزادی پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کرتے چلے جائیں۔ لہٰذا، یہ بات کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آتی کہ اگر آزادی، انسان کا پیدائشی حق ہے، تو پھر اس پر یہ پابندیاں کیوں عائد کی جاتی ہیں؟ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ یہ پابندیاں قانون کی رُو سے عائد کی جاتی ہیں۔ اور قانون کی رُو سے عائد کردہ پابندیاں، انسانی آزادی کو سلب نہیں کرتیں۔ اس لئے کہ اگر پابندیاں عائد نہ کی جائیں تو کسی کا کچھ بھی محفوظ نہ رہے ——— لہٰذا صحیح آزادی کے لئے قانونی پابندیاں لابُدی ہیں۔ یہ درست ہے کہ معاشرہ کے قیام اور افراد کی حفاظت کے لئے قانونی پابندیاں ضروری ہیں، لیکن یہ بھی تو ظاہر ہے کہ اربابِ اقتدار، جنہیں قانون سازی کا اختیار حاصل ہوتا ہے جس قدر ظلم اور زیادتی، قانون کے پردے میں کر سکتے ہیں، لاقانونیت کا استبداد اس کے سامنے ہیچ ہوتا ہے۔ لاقانونیت کے دَور میں یہ استبداد کھلے بندوں ہوتا تھا، اور اس دورِ دستور و آئین میں یہ، قانون کے پردے میں ہوتا ہے۔ صاحبِ اقتدار طبقہ نے جو کچھ کرنا ہوتا ہے پہلے وہ، قانون سازی کی رسم ادا کر لیتا ہے، اور پھر یہ، شاہ مدار کی بسم اللہ پڑھ کر پھونکی ہوئی چھری، جس جانور کے گلے پر پھیر دی جائے وہ ذبیحہ حلال قرار پا جاتا ہے[1]۔ یہ سوال بڑا اہم اور بنیادی ہے جس کا دنیا کو آج تک خاطر خواہ حل نہیں مل سکا کہ انسانی آزادی اور قانونی پابندی میں ایسی مفاہمت کی صورت کس طرح پیدا کی جائے کہ قانونی پابندیاں بھی اپنی جگہ پر قائم رہیں اور افراد کے حقوق بھی پامال نہ ہوں۔ اس کا حل قرآن نے بتایا۔ اس نے اس ضمن میں، پہلے یہ واضح کر دیا کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ..... (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے کتاب اور حکمت اور نبوت بھی کیوں نہ ملی ہو، کہ وہ لوگوں سے کہے کہ وہ اس کے محکوم اور تابع فرمان ہو جائیں۔

---

[1] یوپی کے عام دیہات میں یہ رواج تھا ——— شاید اب بھی ہو۔ کہ گاؤں کا جاہل مُلّا، جسے ذبح کے وقت تکبیر تک پڑھنی نہیں آتی تھی، ایک چھری شاہ مدار کی خانقاہ لے جاتا۔ وہاں کا مجاور، بسم اللہ پڑھ کر چھری پر پھونک دیتا۔ اس چھری سے جو جانور ذبح کیا جاتا اسے حلال سمجھ لیا جاتا۔ سال کے بعد پھر چھری کی تجدید کرا لی جاتی۔

قرآن کے اس اعلانِ عظیم نے انسانی آزادی کا ایسا بلند منشور عطا کر دیا جس کا تصور بھی ذہنِ انسانی نہیں کر سکتا تھا۔[†] یہ تو رہی کامل آزادی کی شکل۔ اب قانونی پابندی کو دیکھئے۔ اس کے لئے اسی آیت میں پہلے مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کہہ کر یہ بات سمجھائی گئی کہ افراد کی آزادی پر پابندیاں لگانا تو ضروری ہیں لیکن یہ پابندیاں کوئی انسان نہیں لگا سکتا۔ اس کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ خدا کی طرف سے یہ پابندیاں کس طرح لگائی جائیں گی؟ کیا یہ وہی تھیاکریسی ہوگی جس میں مذہبی پیشوائیت، خدا کے نام کی آڑ میں، ہر قسم کی من مانی کرتی ہے؟ قرآن نے کہا کہ بالکل نہیں۔ تھیاکریسی تو استبداد کی بدترین شکل ہے، اسی لئے اس نے فرعون کے ساتھ ہامان کو بھی برابر کا مجرم قرار دیا ہے جو مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ تھا۔ قانونی پابندیوں کے لئے اس نے کہا کہ

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۸)

خدا نے ان حدود اور پابندیوں کو، جو انسانی آزادی پر عائد کی جائیں گی، اپنی کتاب میں وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ کسی کو حق حاصل نہیں ہوگا کہ ان پابندیوں میں کسی قسم کی کمی بیشی کر سکے یا ان کے علاوہ کوئی اور پابندی عائد کرے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا عملی مفہوم ہی یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو یہ اقتدار اور اختیار نہیں کہ وہ کسی کو اپنا محکوم اور تابع فرمان (چہ جائیکہ غلام) بنا سکے۔ اب رہا یہ کہ کتاب اللہ میں بیان کردہ حدود اور پابندیوں کی عملی تشکیل اور تنفیذ کی صورت کس طرح متعین کی جائے۔ تو اس کے لئے واضح طور پر بتا دیا گیا کہ یہ حق بھی کسی خاص گروہ اور جماعت کو نہیں دیا گیا، بلکہ یہ تمام افرادِ معاشرہ کا اجتماعی فریضہ ہے۔ یہ امور ان کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے — وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ..... (۴۲/۳۸) یہ حقِ مشاورت بھی، بنیادی حقوق کی فہرست میں داخل ہے، جس میں مرد اور عورت، امیر اور غریب، سب شریک ہیں۔ اس مشاورت کی عملی مشینری، اپنے حالات کے مطابق، خود مرتب کی جا سکتی ہے۔

لہٰذا، قرآنِ کریم نے، یا تو وہ قوانین دے دیئے ہیں جن کی پابندی کرائے گی اور یا وہ حدود متعیّن کر دی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے افرادِ معاشرہ، باہمی مشاورت سے وقتاً فوقتاً قوانین مرتب کر سکیں گے۔ ان حدود سے تجاوز کرنے، یا ان کے علاوہ، اور حدود و قیود متعیّن کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ یہ انسانی آزادی کو سلب کر لینے کے مرادف ہوگا جس کی اجازت کسی انسان کو نہیں دی جا سکتی۔ اسے وہ شرک قرار دیتا ہے۔ سورۂ شوریٰ میں ہے: اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ

[†] ظاہر ہے کہ جو قرآن ایک انسان کو دوسرے ..... انسان کا محکوم بنانے کی بھی اجازت نہیں دیتا، وہ ایک انسان کو دوسرے انسان کا غلام بنانے کی اجازت کب دے گا؟ قرآن نے غلامی کو ختم کر دیا تھا۔ اس کی وضاحت ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتابچہ — غلام اور لونڈیاں — میں ملے گی۔

مِّنَ الدِّیْنِ مَا لَمْ یَاْذَنْ بِہِ اللّٰہُ ۔ط ...... (۴۲/۲۱) کیا ان کے کوئی اور شریک ہیں جو ان کے لئے دینِ خداوندی میں ایسے قوانین بناتے ہیں جن کی اجازت خدا نے نہیں دی؛ لہٰذا، انسانی معاشرہ کے لئے کوئی ایسا قانون مرتب نہیں کیا جا سکتا جس کی اجازت قرآن کریم نے نہ دی ہو۔

یہ ہے وہ طریق جس سے، قرآن کریم، انسانی آزادی پر بھی کوئی حرف نہیں آنے دیتا، اور معاشرہ میں لاقانونیت کبھی نہیں پھیلنے پاتی۔ یہ قرآن کے منشورِ حقوقِ انسانیت کی منفرد خصوصیت ہے۔

(۵)۔ حقِ محنت

قرآن کا ارشاد ہے کہ وَ وُفِّیَتْ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ ...... (۳۹/۷۰) ہر شخص کو اس کے کام کا پورا پورا معاوضہ ملے گا۔ کوئی کسی کی محنت کے ماحصل کو نہ غصب کر سکے گا، نہ اس میں کمی۔ اسی سلسلہ میں اس نے، دوسری طرف یہ کہہ دیا کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ...... (۵۳/۳۹)۔ بجز ان لوگوں کے جو کام کرنے سے معذور رہوں (جن کا ذکر آگے چل کر آتا ہے)، کوئی شخص محنت اور کوشش کے بغیر کچھ حاصل نہیں کر سکے گا۔ یعنی اس معاشرہ میں، ایسے خوان آشام طبقہ (PARASITES) کے لئے قطعاً گنجائش نہیں ہوگی جو دوسروں کی محنت پر تن آسانی اور عیش پرستی کی زندگی بسر کریں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی کسی کی محنت کو سلب (EXPLOIT) نہیں کر سکے گا، تو ہر کام کرنے والا، اپنی محنت کے پورے ماحصل کا حقدار ہوگا۔ اس اصول کی رُو سے نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کٹ جاتی ہے جس کا وجود ہی دوسروں کی محنت کے ماحصل کو غصب کرنے پر ہوتا ہے۔

یاد رکھیئے! جو کام کرنے کے قابل ہونے کے باوجود دوسروں کی محنت کے ماحصل پر زندگی بسر کرتا ہے، وہ گداگر ہے، خواہ کتنا ہی بڑا دولت مند کیوں نہ ہو۔

(۶)۔ عدل و احسان

اس کا نام عدل ہے۔ یعنی ہر شخص کو اس کا حق مل جانا۔ قرآن کی رُو سے عدل ایک بڑی جامع اصطلاح ہے جس میں ہر قسم کے حقوق کا تحفظ شامل ہے۔ جسے قانونی عدل کہتے ہیں، اس سے بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ اگر کسی کا کوئی حق غصب ہوتا ہو، تو عدالت کی مشینری اسے وہ حق دلا دے۔ عدل کے معاملہ میں، قرآن اتنا محتاط اور حُجت رَس ہے کہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ دیکھنا! اس باب میں دوست اور دشمن میں تمیز نہ کرنے لگ جانا۔ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کی طرف سے دشمنی کا برتاؤ تمہیں اس پر آمادہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ عدل نہ کرو۔ اِعْدِلُوْا۔ وہ کچھ بھی کریں، تم ان کے ساتھ ہمیشہ عدل کرو۔ اس لئے کہ یہ ادلے بدلے کی بات نہیں۔ یہ، انسان ہونے کی حیثیت سے ان کا حق، اور اس کی ادائیگی تمہارا فریضہ ہے۔ ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ...... (۵/۸)

قانونی عدل سے مراد ہے، خدا کے مقرر کردہ قوانین و ضوابط کے مطابق، نزاعی امور کا فیصلہ کرنا۔ جب قرآن کریم نے حقِ حکومت کسی انسان کو نہیں دیا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے قانون سازی کا حق کسی انسان (یا انسانوں کے گروہ) کو نہیں دیا۔ عدل، قوانینِ خداوندی کی تنفیذ کا نام ہوگا۔ اگر مملکت کا کوئی قانون، قرآنی ضابطہ کے خلاف ہوگا تو مملکت کے ہر فرد کو یہ حق حاصل ہوگا کہ اسے بدلوائے۔ اور مملکت کا فریضہ ہوگا کہ اسے تبدیل کرے۔

لیکن، قرآن، عدل تک نہیں رہتا۔ اس سے بھی آگے جاتا ہے (جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے) عدل سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ کسی کا واجب (DUE) ہو، وہ اسے دے دیا جائے۔ لیکن اگر اس سے کسی کی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو۔ اس میں کمی رہ جاتی ہو، تو پھر کیا ہو؟ قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ..... (۱۶/۹۰) اس صورت میں، تم اس کی کمی کو پورا کرو، اس کے، اور خود معاشرہ کے توازن کو بگڑنے سے بچا لو۔ اسے احسان کہتے ہیں۔ یہ بھی بنیادی حقوقِ انسانیت میں شامل ہے۔ دنیا ایسے مواقع پر خیرات کی تلقین کرتی ہے، لیکن خیرات سے جس طرح شرفِ انسانیت پامال ہوتا ہے، اور خیرات لینے والے کی عزتِ نفس جس طرح مجروح ہوتی ہے، وہ ظاہر ہے۔ اس لئے قرآن نے احسان، کو خیرات نہیں قرار دیا بلکہ کہا ہے کہ جس کی کمی رہ جائے، وہ اس کمی کو پورا کرنے کے اسباب و ذرائع بطور حق طلب کر سکتا ہے۔ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ..... (۷۰/۲۴) وہ لوگ، جن کی محنت سے اُن کی ضروریات پوری نہ ہوں۔ یا جو محنت کرنے سے معذور ہوں، اُن کا، ان لوگوں کے مال میں حق ہے جن کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ ہے۔ اور یہ حق ڈھکا چھپا نہیں قرآنی معاشرہ میں سب کو معلوم ہے۔ افراد کی ہر قسم کی کمی پوری کرنے کو، بنیادی حقوق کی فہرست میں شامل کرنا قرآن کے سوا آپ کو کہیں نظر نہیں آئے گا۔

(۷) رزق کا حق

انسان (بلکہ ہر ذی حیات) کی زندگی کا مدار، سامانِ زیست پر ہے۔ دنیا کا فیصلہ یہی ہے کہ یہ ہر فرد کی اپنی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اور اپنی اولاد کے لئے سامانِ زیست خود پیدا یا مہیا کرے۔ لیکن قرآن کریم اس باب میں ساری دنیا سے منفرد ہے۔ کہتا ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُهَا ..... (۱۱/۶) دنیا میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق یعنی سامانِ زیست کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔

اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جن ذمہ داریوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، قرآنی نظام میں وہ ذمہ داریاں خود نظامِ مملکت کی ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا، یہ قرآنی مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ کوئی ذی حیات اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔ اور وہ تمام افرادِ معاشرہ سے علانیہ کہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ..... (۶/۱۵۲)۔ ہم تمہاری

ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے بھی ذمہ دار ہیں۔ اور تمہاری اولاد کی ضروریات پوری کرنے کے بھی۔ بنیادی ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا جانا، ہر انسان کا بنیادی حق ہے جسے وہ قرآنی نظامِ معاشرہ سے ہر وقت طلب کر سکتا ہے۔ یہ حق آپ کو دنیا کے کسی چارٹر میں نہیں ملے گا۔

اس کی وضاحت میری کتاب نظامِ ربوبیت میں ملے گی۔

جہاں تک اولاد کے لئے رزق مہیا کرنے کا تعلق ہے اس میں ان کی صحیح تعلیم و تربیت بھی شامل ہے۔ کیونکہ جہاں قرآن نے کہا ہے کہ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ..... (۶/۱۵۲)۔ اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کر دو۔ تو اس میں "قتل" کے معنی جان سے مار ڈالنا ہی نہیں۔ اس سے مراد علم و تربیت سے محروم رکھنا بھی ہے۔ لہٰذا، قرآنی معاشرہ کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے تمام بچوں کی عمدہ تعلیم و تربیت ہو۔ بنا بریں، قرآن کی رُو سے، سب بچے، عمدہ پرورش اور صحیح تعلیم و تربیت بطور اپنے حق کے طلب کر سکتے ہیں، اور کوئی انہیں اس حق سے محروم نہیں کر سکتا۔

(۸)۔ جان کی حفاظت

لیکن ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری سے پہلے، انسانی جان کی حفاظت کی ضمانت سامنے آتی ہے۔ قرآن نے اس باب میں واضح طور پر کہہ دیا کہ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ..... (۶/۱۵۲) خدا نے انسانی جان کو واجب الاحترام قرار دیا ہے اس لئے کسی کو اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ کسی کو جان سے مار دے۔ ہاں! اگر حق کا تقاضا ہو تو ایسا کیا جا سکتا ہے! حق کے تقاضے کے کیا معنی ہیں، اسے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کر دیا کہ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ..... اگر کوئی کسی کو ناحق قتل کر دے، تو اس جرم کی پاداش میں اُسے سزائے موت دی جا سکتی ہے۔ یا اگر کوئی شخص معاشرہ کے نظامِ عدل و امن کو تہس نہس کرنے کی کوشش کرے، اور کسی طرح، اپنی اس تباہ کن روش سے باز نہ آئے تو اسے بھی موت کی سزا دی جا سکتی ہے۔ ایسی صورتوں کے علاوہ، اگر کوئی کسی انسانی جان کو ناحق تلف کر دے تو یوں سمجھو کہ اس نے ایک جان کو تلف نہیں کیا، پوری نوعِ انسان کو تلف کر دیا ہے۔ اس کے برعکس، وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ..... (۵/۳۲) جس نے کسی ایک انسان کی جان بچائی تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوعِ انسان کی جان بچائی۔

آپ نے غور فرمایا کہ جن مخصوص حالات میں قرآن کریم نے کسی انسان کی جان لینے کی اجازت دی ہے۔ (یعنی قانون کی رُو سے سزائے موت) وہ بھی درحقیقت عالمگیر انسانی حقوق کی محافظت کے لئے ہے۔ اسی کو بالحق کہا گیا ہے۔

(۹)۔ مال کی حفاظت

جان کی حفاظت کے بعد ان چیزوں کی حفاظت بھی بنیادی حقوق میں داخل ہے جو، قانونِ خداوندی

کی رُو سے، افراد کے ذاتی تصرّف میں رہیں۔ کسی کو اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ دوسروں کی ان چیزوں کو ناجائز طور پر اپنے تصرّف میں لے آئے۔ اسی لئے فرمایا کہ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ...... (۲/۱۸۸)۔ تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریق سے مت کھاؤ۔ "مال" ایک جامع اصطلاح ہے جس میں ہر قسم کی مقبوضات آجاتی ہیں۔ اور اس کا تحفظ ہر شخص کا بنیادی حق ہے۔

یہاں سے ایک اہم نکتہ سامنے آتا ہے۔ اگر کسی کے ہاں چوری ہو جائے یا ڈاکہ پڑ جائے، تو دنیا کے مروّجہ نظامِ عدل کی رُو سے، مجرم کو سزا دے دی جاتی ہے لیکن جس کا مال چلا گیا تھا، اس کے نقصان کی تلافی نہیں ہوتی۔ اگر یہ نقصان اس کی اپنی غلطی۔ تساہل یا تغافل کی وجہ سے نہیں ہوا، تو اس کی تلافی کا وہ حقدار ہوگا۔ اس اصول کا اطلاق، تا بحدِ امکان دیگر قسم کے نقصانات پر بھی ہوگا۔

(۱۰)۔ سکونت کی حفاظت

جان اور مال کی حفاظت کے بعد، قرآنِ کریم، ہر فرد کو سکونت کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔ اس نے یہودیوں کے خلاف جو فردِ جرم مرتب کی ہے اس میں یہ بھی کہا ہے کہ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ...... (۲/۸۵) تم وہ ہو، جو اپنے لوگوں کو ناحق قتل کر دیتے ہو، اور انہیں ان کے گھروں سے نکال دیتے ہو۔ لہٰذا، افرادِ معاشرہ کو سکونت مہیا کرنا مملکت کا فریضہ ہے اور کسی کو بے گھر، بے در، بنا دینا، اس کے اس بنیادی حق کو غصب کر لینا۔

(۱۱)۔ عصمت کی حفاظت

عصمت، انسان کی بے بہا متاع ہے۔ یہ وہ بلند ترین قدر ہے جو صرف انسان کا خاصہ ہے۔ حیوانات میں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ جنسی اختلاط ایک طبیعی جذبہ ہے جس میں انسان اور حیوان سب شریک ہیں۔ لیکن عصمت کا جذبہ صرف انسانی سطحِ زندگی کا تقاضا ہے۔ لہٰذا، قرآنِ کریم کی اس حفاظت کو مستقل حقِ انسانیت قرار دیتا ہے۔ اسی لئے اُس نے اس حق کی پامالی کو ایک ایسا جرم قرار دیا ہے جس کی سزا بڑی سخت ہے: اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ...... (۲۴/۲)۔ زانی مرد ہو یا عورت۔ انہیں سو سو کوڑوں کی سزا دو۔

صرف جرمِ زنا کا ارتکاب ہی نہیں۔ اس کے نزدیک، شریف عورتوں کے خلاف تہمتِ بےجا بھی سنگین جرم ہے۔ جس کی سزا اسّی کوڑے ہے (۲۴/۴) اس لئے کہ اس سے بھی ان کی عصمت پر حرف آجاتا ہے۔

اور شریف زادیوں کو چھیڑنا اور تنگ کرنا۔ ان کے خلاف طعن آمیز اور اضطراب انگیز باتیں پھیلانا

کہ لوگوں کے جذبات کو ان کے خلاف مشتعل کرنا، اُس کے نزدیک، اس سے بھی بڑا جرم ہے۔ اس جرم کی پاداش میں، اس نے کہا ہے کہ ایسے لوگوں کو شہر بدر کر دیا جائے۔ انہیں حقوقِ شہریت سے محروم کر دیا جائے۔ اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئیں تو ان کے خلاف وارنٹ بلاضمانت جاری کر کے انہیں گرفتار کیا جائے اور جرم ثابت ہونے پر انہیں قتل کیا جائے اس طرح کہ ان کی پارٹی کا کوئی فرد بھی سزا سے بچنے نہ پائے۔ وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ..... (۳۳/۶۱) یہ وہ قانونِ خداوندی ہے جس کے متعلق کہا کہ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝ (۳۳/۶۲)۔ یہی قانون، خدا نے اقوامِ سابقہ کو بھی دیا تھا۔ اور یہ ایسا محکم قانون ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

ان تمام حقوق کی حفاظت مملکت کا فریضہ ہے۔

(۱۲) شادی میں انتخاب کا حق

تعلقِ زوجین کے سلسلہ میں، قرآن کریم نے اس امر کی صراحت بھی کر دی ہے کہ شادی میں، اپنی مرضی سے انتخاب بھی بنیادی حق ہے۔ اس نے مردوں سے کہا کہ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ ..... (۴/۳) تم اپنی پسند کی عورتوں سے شادی کرو۔ دوسری طرف یہ کہہ کر عورتوں کے حقِ انتخاب کی حفاظت کر دی کہ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ..... (۴/۱۹) تم عورتوں کے زبردستی مالک نہیں بن سکتے۔ نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں فریقین کی رضامندی بنیادی شرط ہے۔

اس سلسلہ میں ضمناً اتنا اور واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے، معاہدۂ نکاح کے بعد، خاوند اور بیوی کے حقوق اور ذمہ داریاں یکساں ہوتی ہیں ——— صرف ایک بات میں مرد کو رعایت دی گئی ہے ——— اور وہ یہ کہ طلاق (یا بیوگی) کی صورت میں، عورت کو عدّت کی مدت میں نکاحِ ثانی کی اجازت نہیں ہوتی۔ اور مرد کے لئے کوئی عدّت نہیں۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ یعنی اس دوران میں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ عورت حمل سے تو نہیں۔ یہ حکم، پیدا ہونے والے بچے کے حق کی حفاظت کے لئے ہے۔ یعنی یہ متعین کرنے کے لئے کہ وہ کس کا بیٹا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے، وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ..... (۲/۲۲۸) عورتوں کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جتنی ان کی ذمہ داریاں ہیں۔ صرف ایک معاملہ ایسا ہے جس میں مرد کو ایک خصوصی درجہ حاصل ہے۔ اور وہ یہ کہ اُسے عدّت نہیں گذارنی پڑتی۔

ان حقوق کا تحفظ مملکت کا فریضہ ہے۔

(۱۳) حسنِ ذوق کا حق

قرآن، انسان کے انفرادی حسنِ ذوق (AESTHETIC TASTE) کا احترام کرتا ہے اور کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ اُسے اس حق سے محروم کر دے۔ اس نے بڑی تحدی سے کہا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ

زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط ...... (۷/۳۲)۔ ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو جنہیں خدا نے اپنے بندوں کے ذوق کی تسکین کے لئے بنایا ہے، اور خوشگوار سامانِ زیست کو، حرام قرار دے؛ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے، ان سے لطف اندوز اور کیف یاب ہونا، ہر فرد کا بنیادی حق ہے جس سے اسے کوئی محروم نہیں کر سکتا۔ اصولاً یہ سمجھ لیجئے کہ جس چیز کو خدا نے حرام قرار نہیں دیا، اسے کوئی حرام قرار نہیں دے سکتا۔ یہ انسانی آزادی کو سلب کر لینے کے مرادف ہے جس کا حق کسی انسان کو نہیں پہنچتا۔ اسی ضمن میں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کھانے پینے کے انداز اور رہنے سہنے کے طریق پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتا بلکہ اس میں ہر ایک کو اس کے ذوق کے مطابق حقِ انتخاب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں کے گھروں میں سے جس کے ہاں جی چاہے کھاؤ پیو، اور خواہ اکٹھے بیٹھ کر کھاؤ یا الگ الگ کھاؤ، اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ط... (۲۴/۶۱) اسی طرح وہ لباس کے معاملہ میں بھی وضع قطع اور تراش خراش پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتا اور ہر ایک کے حسنِ ذوق کی رعایت رکھتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ لباس کا مقصد ستر پوشی کے علاوہ، زینت بھی ہے؛ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ط ...... (۷/۲۶)۔ وہ سونے کے زیورات۔ چاندی اور شیشے کے برتن۔ باریک اور دبیز ریشمی ملبوسات۔ اعلیٰ درجے کے صوفے (۱۸/۳۱؛ ۷۶/۱۵-۱۳) اور اسی قسم کا دیگر سامانِ آرائش و زیبائش، جنتی زندگی کا خاصہ قرار دیتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بہ ہیئتِ مجموعی معاشرہ کا تمدنی معیار اتنا بلند ہونا چاہیئے کہ یہ چیزیں تمام افرادِ معاشرہ کو میسر ہوں۔ جنتی زندگی میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ ایک خاص طبقہ ان آسائشوں سے بہرہ یاب ہوگا۔ اور دوسرے لوگ ان سے محروم ہوں گے۔ جنتی زندگی میں جو کچھ کسی ایک فرد کو میسر ہوگا، وہی کچھ دیگر افراد کو میسر ہوگا۔

(۱۴) مذہبی آزادی کا حق

مذہب کے معاملہ میں قرآنِ کریم ہر انسان کو پوری پوری آزادی دیتا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان نام ہے، صداقت کو عقل و فکر کی رو سے علیٰ وجہ البصیرت ماننے کا ——— لہٰذا اس میں جبر و اکراہ کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ... (۱۸/۲۹)۔ ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے (اس قرآن میں) آچکا ہے۔ تم اس پر غور و فکر کرو، اور اس کے بعد جس کا جی چاہے اسے تسلیم کرے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ اس نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ خارجی کائنات اور انسان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے اس راستے پر چلنے کے لئے مجبور ہے جو اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ لیکن انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اسے راستہ دکھا دیا گیا ہے اور اس کے بعد، یہ اس کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس راستے کو اختیار کرے۔ یا اس سے انحراف

برتے۔ وہ اگر اسے اختیار کرے گا تو اس کی زندگی خوشگواریوں میں گزرے گی۔ اس سے سرتابی برتے گا، تو نقصان اٹھائے گا۔ اگر اسے مجبوراً صحیح راستے پر چلانا مقصود ہوتا تو اسے بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح مجبور پیدا کر دیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اسے صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اب یہ بات منشائے خداوندی کے خلاف ہوگی کہ اسے ایک خاص راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ قرآن میں نبی اکرم کو مخاطب کر کے فرمایا۔۔۔ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا ط ۔۔۔۔ اگر تمہارے خدا کے پروگرام میں یہ ہوتا کہ انسان کو ایمان کے راستے پر مجبوراً چلایا جائے تو اس کے لئے ایسا کرنا کیا مشکل تھا؟ وہ انسانوں کو پیدا ہی ایسے کرتا کہ وہ سب کے سب، آنکھ بند کئے، بھیڑ بکریوں کی طرح اسی راستے پر چلے جاتے۔ لیکن اس نے انسان کو ایسا پیدا نہیں کیا۔ اسے اس باب میں اختیار دیا گیا ہے۔۔۔ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (۱۰/۹۹) تو کیا تو انہیں مجبور کرے گا کہ وہ بالضرور ایمان لے آئیں۔ یہ تو مشیّتِ خداوندی کے خلاف ہوگا۔ اس لئے تیرا کام یہ ہے کہ تو اس پیغام کو ان لوگوں تک پہنچائے جا۔ اس سے زیادہ کا تو مکلف نہیں۔ لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ ج ۔۔۔۔ (۲/۲۵۶)۔ غلط اور صحیح راستہ (اس قرآن کے ذریعے) متمیز ہو کر سامنے آچکا ہے۔ اس کے بعد، دین کے معاملہ میں کسی پر کوئی جبر نہیں ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک مذہب نہیں (مذہب کا لفظ سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا)۔ اس لئے وہ مذاہبِ عالم میں سے کسی کو اپنا حریف نہیں قرار دیتا۔ وہ ایک دین، یعنی ضابطہ زندگی یا مملکتی نظام ہے۔ وہ اس کی اجازت تو نہیں دے سکتا کہ اس کی حدودِ مملکت میں رہنے والے کوئی دوسرا نظام مملکت قائم کریں ۔۔ یہ تو "ریاست درونِ ریاست" (STATE WITHIN A STATE) قائم کرنے کے مرادف ہوگا جس کی کہیں بھی اجازت نہیں مل سکتی۔ لیکن وہ اس سے بھی کچھ تعرض نہیں کرتا کہ اس کے حدودِ مملکت میں رہنے والے اپنے لئے مذہب کونسا پسند کرتے ہیں ۔۔۔ اتنا ہی نہیں کہ وہ ہر ایک کو مذہبی آزادی عطا کرتا ہے۔ وہ جہاں اپنے نظام کے مراکز، یعنی مساجد کی حفاظت کرتا ہے وہاں، تمام اہلِ مذاہب کی پرستش گاہوں کی بھی حفاظت اپنے ذمے لیتا ہے۔ وہ اسلامی مملکت کے وجود کی ایک وجہ جواز یہ بھی بتاتا ہے کہ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا ط ۔۔۔۔ (۲۲/۴۰) اگر اللہ انسانوں کے ذریعے، سرکش قوتوں کی روک تھام کا انتظام نہ کرتا، تو یقیناً راہبوں کی خانقاہیں۔ عیسائیوں کے گرجے۔ دیگر اقوام کی پرستش گاہیں۔ اور مسجدیں جن بکثرت خدا کا نام لیا جاتا ہے ڈھا دی جاتیں۔ لہٰذا، ان تمام معبدوں کی حفاظت، قرآنی مملکت کی ذمہ داری ہے، جس کا ہر غیر مسلم، بطور اپنے حق کے مطالبہ کر سکتا ہے۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے جماعت مومنین سے تاکیداً کہا ہے کہ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ ۔۔ تم، غیر مسلموں کے

معبودوں کو گالی مت دو۔ تم ایسا کرو گے تو وہ، اس کے جواب میں بربنائے جہالت، اللہ کو گالی دے دیں گے۔ سو جس طرح تمہیں یہ بُرا لگے گا، اسی طرح انہیں، ان کے معبودوں کو تمہارا گالی دینا بھی بُرا لگتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ..... (۶/۱۰۹) ہر ایک کو اپنا اپنا مسلک اور اپنا اپنا معبود پسند ہوتا ہے۔ تم ان تک حق کی بات پہنچاؤ جب یہ بربنائے علم و بصیرت، غلط اور صحیح میں تمیز کرنے کے قابل ہو جائیں گے، تو خود بخود، اپنے معبودانِ باطل کو چھوڑ کر، صحیح نظامِ زندگی اختیار کر لیں گے۔ تم ان سے مجبوراً ایسا نہیں کرا سکتے۔

لہٰذا، قرآن، نوعِ انسان کو، مذہبی آزادی کا حق ہی نہیں دیتا۔ بلکہ اس کی بھی ضمانت دیتا ہے کہ کوئی ان کے معبودوں کے خلاف زبان درازی یا ان کی شان میں گستاخی نہ کرے۔

اس مقام پر میں، اپنے موضوع سے ذرا سے گریز (DIGRESSION) کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ خدا نے تو مذہب کے معاملہ میں انسان کو اس قدر آزادی عطا کی ہے، لیکن ہمارے اربابِ شریعت کا فتویٰ ہے کہ غیر مسلموں کو تو اس کا حق دیا جا سکتا ہے کہ وہ جو چاہے اپنے مذہب پر رہیں اور جو چاہے اسے تبدیل کر لیں۔ لیکن ایک مسلمان کو اس کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ اگر مسلمان مذہب تبدیل کرے گا تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ یہی نہیں کہ اگر وہ اسلام چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کر لے تو اُسے قتل کر دیا جائے گا، بلکہ یہاں تک بھی کہ اگر کسی معاملہ میں اُس کے خیالات ان اربابِ شریعت سے مختلف ہوں اور اس بنا پر یہ اُسے مرتد قرار دے دیں، تو بھی اُسے قتل کر دیا جائیگا۔

واضح رہے کہ اس کی تو ہر ایک کو آزادی ہو گی کہ وہ چاہے تو الدّین (اسلامی نظام) کے تحت آجائے اور چاہے اس کے باہر (غیر مسلم) رہے۔ لیکن اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ بطیبِ خاطر اسلامی نظام اختیار کرے اور اس کے بعد اس نظام کے احکام میں سے جس حکم کو جی چاہے مانے اور جس سے جی چاہے انکار اور سرتابی اختیار کرے۔ اس قسم کی آزادی تو کسی مملکت میں بھی مل نہیں سکتی۔ اسے مملکت کے تمام قوانین کی اطاعت کرنی ہو گی۔ ہاں! اگر وہ کسی وقت اس قسم کی اطاعت کو ناقابلِ قبول سمجھے، تو اسلام کو چھوڑ کر، کوئی دوسرا مذہب اختیار کرے۔ اس کے جی چاہے تو اسلامی مملکت میں غیر مسلم (ذمی) کی زندگی بسر کرے اور جی چاہے کسی اور ملک میں چلا جائے۔

(۰)

اس گریز کے بعد، میں پھر اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ قرآن کی رُو سے، اگلا بنیادی حق ہے۔

(۱۵) سچی بات کہنے کا حق

قرآنِ کریم نے افراد کو سچی بات کہنے کا حق ہی عطا نہیں کیا بلکہ اس کا حکم دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اسے افراد کی مرضی پر نہیں چھوڑا کہ وہ حق بات کہیں یا نہ کہیں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ وہ، جہاں بھی ضرورت ہو، حق بات کہنے کے لئے اپنے آپ کو خود پیش کریں۔ اب یہ دیکھئے کہ اس باب میں قرآنِ کریم

کہاں تک جاتا ہے۔ اس کا حکم ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ..... اے جماعتِ مومنین! تمہارا فریضہ ہے کہ تم عدل و انصاف کو دنیا میں قائم رکھو۔ اس کے لئے بنیادی ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ سچی بات بلا رو رعایت کی جائے۔ اس ضمن میں تم سمجھ لو کہ جب کسی معاملہ کے متعلق کچھ کہنے کا وقت آئے تو یہ نہ خیال کرو کہ تم کسی پارٹی یا فریق کی طرف سے شہادت دینے کے لئے آئے ہو۔ تم یہ سمجھو کہ تم صرف اپنے خدا کی طرف سے شاہد بن کر آئے ہو ـــــ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ۔ پھر سچی بات کہہ دو۔ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ..... خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ (آپ نے غور فرمایا کہ اس باب میں قرآن، انسان کو کس مقام تک لے جاتا ہے؟) اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ج..... خواہ وہ تمہارے والدین یا دیگر عزیز رشتہ داروں کے خلاف کیوں نہ جائے۔ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا..... جس کے خلاف یہ شہادت جاتی ہے، وہ امیر ہو یا غریب، اس کی پرواہ مت کرو۔ اس لئے کہ فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا فَلَا..... اللہ کا حق ان دونوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ یاد رکھو! اپنے مفاد کا تحفظ، عزیز رشتہ داروں کی محبت اور تعلقات اس پارٹی سے نقصان کا احتمال جو دولت مند ہے۔ یہ تمام جذبات تمہاری راہ روک کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ لیکن فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا ج..... تم ان جذبات کا اتباع قطعاً نہ کرو اور ہمیشہ عدل کے تقاضے کو ملحوظ رکھو۔ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۝ (۴/۱۳۵) ـــ نہ ہی تم توڑ مروڑ کر، ذو معنی بات کرو۔ اور نہ ہی اس سے پہلو تہی کرو۔ ایسا کرنے سے ہو سکتا ہے کہ تم دوسرے لوگوں کو دھوکا دے سکو، لیکن تم اللہ کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ اسے سب کچھ معلوم ہے۔ اس لئے سچی بات کہنے کے لئے دھڑلے سے سامنے آؤ اور، لگی لپٹی بغیر، صاف صاف دوٹوک بات کرو۔

اِدھر یہ کہا۔ اور دوسری طرف معاشرہ سے تاکید کی کہ اس کا انتظام کرو کہ شہادت دینے والے کو کوئی کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائے: وَلَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ وَّلَا شَھِیْدٌ ط (۲/۲۸۲)۔

(۱۶)۔ اظہارِ خیال کا حق

اظہارِ خیال کا حق بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔ قرآن کریم نے انسان اور حیوانات میں ایک بنیادی فرق یہ بھی بتایا ہے کہ حیوانات، اپنے مافی الضمیر کے اظہار کی (انسانوں کی طرح) صلاحیت نہیں رکھتے اور انسانوں کو اس کی صلاحیت اور استعداد دی گئی ہے۔ فرمایا: خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَہُ الْبَیَانَ (۵۵/۳-۴) خدا نے انسان کو پیدا کیا اور اسے قوتِ گویائی (یا اظہارِ خیال کی صلاحیت) عطا کی۔ دوسری جگہ ہے: اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ..... (۹۶/۴) خدا وہ ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعے بھی اظہارِ خیال کی صلاحیت عطا کی۔ یعنی، زبان یا قلم کے ذریعے اظہارِ خیال کا حق اُسے، انسان ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے۔

واضح رہے کہ اظہارِ خیال (یا خدا کی عطا کردہ کسی اور صلاحیت) کا خلافِ قانونِ خداوندی استعمال جرم قرار پاتے گا اور مستوجبِ سزا۔ لیکن کسی صلاحیت کے خلافِ قانونِ خداوندی استعمال کو جرم قرار دینا، اور بات ہے اور اس حق کو سلب کر لینا، اور بات۔ ان صلاحیتوں کے غلط استعمال کو جرم قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کے حق استعمال کو سلب نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا کرنا تو انسان کو حیوان بنا دینے کے مرادف ہوگا۔

(۱۷)۔ رازوں کی حفاظت کا حق

قرآن کریم نے اس منع کیا ہے کہ کسی کے رازوں کی خواہ مخواہ ٹوہ لگائی جائے۔ وَلَا تَجَسَّسُوْا..... (۴۹/۱۲) اس کا ارشاد ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ افراد کو اس کی ضمانت دیتا ہے کہ ان کے راز، افشا نہیں کئے جائیں گے۔ (جرائم کی تحقیق کے سلسلہ میں ایسا کرنا کچھ اور معنی رکھتا ہے) خط و کتابت کی حفاظت کا حق بھی اسی ذیل میں آجاتا ہے۔ اسی طرح وہ، ہر شخص کو پرائیویسی کا حق بھی دیتا ہے جب کہتا ہے کہ لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا..... (۲۴/۲۷) تم اپنے گھروں کے علاوہ، کسی اور کے گھر میں، ان کی اجازت کے بغیر مت داخل ہو۔

(۱۸) حیثیتِ عرفی کے تحفظ کا حق

جس چیز کو عام طور پر حیثیتِ عرفی کہا جاتا ہے، قرآن اس کی حفاظت کا بھی حق دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ..... (۴/۱۴۸) ۔ اللہ اسے پسند کرتا کہ کسی کی بُری بات کو خواہ مخواہ اچھالا جائے۔ اس کی اصلاح مطلوب ہو تو خاموشی سے ایسا کیا جائے۔ ——— پھر ارشاد ہے کہ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ..... (۴۹/۱۱) کوئی پارٹی کسی دوسری پارٹی کا مذاق نہ اڑائے۔ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ..... کسی کے اُلٹے پلٹے نام نہ رکھے جائیں۔ محض ظن اور گمان کی بنا پر کسی کو مطعون نہ کیا جائے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ..... (۴۹/۱۲) اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جب تک کسی کے خلاف کوئی جرم ثابت نہ ہو جائے، اُسے مجرم نہ سمجھا جائے، بلکہ کہا یہ جائے کہ هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ (۲۴/۱۲) وَهٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (۲۴/۱۶) اور یہی نہیں کہ ظن اور قیاس کی بنا پر، کسی کے سامنے اس کی بُرائی نہ کی جائے، بلکہ اس کی پیٹھ پیچھے بھی ایسا نہ کیا جائے کہ یہ غیبت ہوگی۔ اور غیبت سے قرآن نے سختی سے روکا ہے۔ وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا..... (۴۹/۱۲) اس قسم کے تاکیدی احکامات سے، قرآن، افراد کی حیثیتِ عرفی کا تحفظ کرتا ہے۔

(۱۹) امن کی ضمانت

ان تمام حقوق سے آگے بڑھ کر، قرآنِ کریم یہ ضمانت دیتا ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ (۲/۳۸)

انہیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ خوف خارجی خطرات کی طرف سے اندیشہ کا نام ہے۔ لہٰذا، اس معاشرہ میں، ہر فرد، ہر قسم کے بیرونی خطرات سے محفوظ ہوگا۔ اور حزن۔ اس افسردگی کو کہتے ہیں جو پریشانیوں کی وجہ سے لاحق ہوتی ہے۔ لہٰذا، جہاں اس معاشرہ کا یہ فریضہ ہوگا کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ افرادِ معاشرہ بیرونی خطرات سے امن میں رہیں، وہاں اس کی یہ ذمہ داری بھی ہوگی کہ وہ اُن پریشانیوں کو دُور کرے جو لوگوں کے لئے وجہِ افسردگی بنتی ہیں۔ خوف اور حزن سے مامونیت ایسی جامع کیفیت ہے جس میں داخلی اور خارجی ہر قسم کے اندیشوں اور پریشانیوں سے حفاظت کا تصور آجاتا ہے۔ اسی حفاظت میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ..... (۶/۱۶۵) اس میں کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔ ذمہ داری کسی کی ہو اور اسے سرانجام کوئی اور دے۔ کام کسی کا ہو اور مفت میں بے گار کوئی اور بھگتے۔ جرم کسی نے کیا ہو اور دھڑ کا کسی اور کو لگا ہوا ہو۔ یہ ہے امن کی وہ ضمانت جس سے ہر شخص کو حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کا حصول ہر فرد معاشرہ کا بنیادی حق ہے۔

(۰)

حقوق کا موازنہ

یہ ہیں، وہ بنیادی حقوق جنہیں قرآن، حقوقِ انسانیت کی حیثیت سے تسلیم کرتا، اور جن کی ضمانت قرآنی معاشرہ دیتا ہے۔ یہ صرف بڑے بڑے حقوق کی فہرست ہے، ورنہ چھوٹے چھوٹے کئی اور حقوق ہیں، جن کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔ آپ ان حقوق کو سامنے رکھیئے، اور پھر ان کا موازنہ ان حقوق سے کیجئے جن کا ذکر اقوامِ متحدہ (UNO) کے چارٹر میں کیا گیا ہے۔ آپ پر یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جائے گی کہ انسانی فکر، اپنی (اس وقت تک کی) انتہائی بلندیوں کے باوجود، کہاں تک جا سکا ہے، اور وحیِ خداوندی، اس باب میں، انسان کو کہاں لے جاتی ہے — اور اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ وحیِ خداوندی (قرآن کریم) نے انسانوں کو یہ حقوق اس زمانے (چھٹی صدی عیسوی) میں عطا کئے تھے جب انسان، اپنے بنیادی حقوق کے تصور تک سے ناآشنا تھا۔

کوئی حق مطلق نہیں

قرآنی حقوقِ انسانیت کی فہرست کا، اقوامِ متحدہ کے مرتب کردہ منشور کے ساتھ موازنہ کے بعد، ایک اور اہم حقیقت پر بھی غور کیجئے۔ جس زمانے میں یو۔ این۔ او کا منشور زیرِ تحقیق تھا، انجمن اقوامِ متحدہ کی (EDUCATIONAL SCIENTIFIC & CULTURAL ORGANISATION) نے (جسے عام طور پر UNESCO کہا جاتا ہے)، اس موضوع پر ایک سوالنامہ مرتب کیا اور اسے دنیا بھر کے مشہور اربابِ فکر و نظر کے پاس بھیجا کہ وہ ان حقوق کے متعلق اپنی آراء کا اظہار کریں۔ (UNESCO) نے ان میں سے بلند پایہ مشاہیر کے مقالات کو ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کیا جس کا تعارف (JACQUES MARITAIN) نے لکھا تھا۔ ان مقالات میں جس بات کو نمایاں طور پر تسلیم کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے کوئی حقوقِ مطلق

(ABSOLUTE) یا یہی نہیں۔ مسٹر (MARITAIN) کے الفاظ ہیں:۔

یہ حقیقت بدیہی ہے کہ تمام حقوق، بالآخر انسانی حقوق ہیں (خدائی حقوق نہیں) اور دیگر تمام انسانی حقوق کی طرح ایسے کہ ان پر حدود و قیود عائد کی جائیں اور انہیں قابلِ ترمیم و تبدیل قرار دیا جائے۔ حتیٰ کہ جن حقوق کو بلا مشروط کہا جاتا ہے، ان میں بھی، ان حقوق کے مالک ہونے میں اور ان کے استعمال کا حق رکھنے میں بنیادی فرق ہے۔ ملکیت بجا ہے۔ لیکن ان کا استعمال ان حدود اور پابندیوں کے مطابق ہوگا جو ان پر از رُوئے عدل عائد کی جائیں گی۔

لیجئے! ایک ہی تشریح نے، بنیادی حقوقِ انسانیت کی رفیع الشان عمارت، دھڑام سے نیچے گرا دی۔ انسان جس بات کی ضمانت چاہتا ہے ۔۔ اور جس ضمانت سے اسے حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے ۔۔ وہ یہ ہے

مشروط حقوق

کہ اس کے کچھ حقوق ایسے ہیں جو اسے محض انسان ہونے کی حیثیت سے بلا مشروط حاصل ہیں۔ نہ ان حقوق میں کوئی ردّ و بدل کر سکتا ہے، نہ من مانی حدود و قیود عائد کر سکتا۔ لیکن جب ایک طرف، اس کے ہاتھ میں حقوق کی فہرست دے دی جائے، اور دوسری طرف اس سے یہ کہہ دیا جائے کہ اربابِ اقتدار (PARIY IN POWER) کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ "از روئے عدل" ان حقوق پر جو پابندیاں چاہے عائد کر دے تو اس سے اسے خاک اطمینان حاصل ہوگا؟ وہ اربابِ اقتدار کی دخل اندازی سے بچنے کے لئے ہی تو حقوق چاہتا تھا۔ اگر وہ دخل اندازی بدستور رہے، تو اسے اس قسم کے حقوق سے حاصل کیا ہوگا؟ مختلف اقوامِ عالم کے ہاں، اربابِ اقتدار کے ہاتھوں، ان حقوق کی جس قدر مٹی پلید ہوتی ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اور یہ سب "عدل و انصاف" کی خاطر، اور آئین و قانون کے نام سے کیا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم نے اس باب میں، بات بالکل واضح کر دی۔ اس نے بیشتر حقوق کو حقوقِ مطلق قرار دیا جن پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ (مثلاً رزق، یعنی بنیادی ضروریاتِ زندگی حاصل ہونے کا حق۔ احترامِ انسانیت کا حق۔ صحیح تعلیم و تربیت کا حق۔ عدل و احسان کا حق۔ تحفظِ عصمت کا حق۔ اور اسی قسم کے دیگر حقوق جو یکسر غیر مشروط ہیں) اور جو حقوق مشروط ہیں، ان کی شرائط اور حدود کو بھی خود ہی متعین کر دیا اور ان دونوں کو یہ کہہ کر مکمل اور غیر متبدل قرار دے دیا کہ "وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ..." (6/116)۔ تیرے رب کی بات صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئی۔ اب ان امور میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں۔ اسی مکمل اور غیر متبدل ضابطۂ حیات کا نام قرآن ہے، جو دنیا میں حقوقِ انسانیت کا واحد ضامن ہے۔

یہ تو رہا ان حقوق کے مشروط اور قابلِ تغیّر و تبدّل ہونے کے متعلق جو اقوامِ متحدہ کے چارٹر میں مذکور ہیں۔

اقوام اس چارٹر پر عمل نہیں کرتیں

اس کے بعد، اس سے بھی زیادہ اہم بات سامنے آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ، ہر چند اس چارٹر کو اقوامِ عالم کے نمائندوں نے منظور اور تسلیم کیا ہے، لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ قومیں اس پر عمل بھی کریں گی۔ اس

ضمن میں، شکاگو یونیورسٹی کا پروفیسر (QUINCY WRIGHT) اپنے مقالہ میں لکھتا ہے:-

تجربہ نے بتایا ہے کہ اس باب میں کسی قوم پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہر حال میں، حقوقِ انسانیت کا احترام کرے گی۔ گذشتہ دنوں، اقلیتوں پر جس قدر مظالم کئے گئے ہیں اس سے انسانی ضمیر کانپ اٹھتا ہے۔ اگر مجلسِ اقوامِ متحدہ فی الواقعہ چاہتی ہے کہ ان حقوق کا احترام ہو تو اسے چاہیئے کہ یہ تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لے، اور اقوامِ عالم کے اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) کی روشنی میں اس میں تبدیلی پیدا کرے۔

پروفیسر رائٹ ان حقوق کے تحفظ کے لئے یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ اقوامِ عالم، اس باب میں اپنے اقتدارِ اعلیٰ کو، اقوامِ متحدہ کی تحویل میں دیدیں۔ اس کے برعکس ہمیں سیاسی اُفق پر یہ دکھائی دیتا ہے کہ مرحوم لیگ آف نیشنز کی طرح، انجمن اقوامِ متحدہ کا وجود ہی خطرہ میں ہے۔ کئی اقوام نے انجمن کو اپنے واجبات تک ادا نہیں کئے۔

اس مقام پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب حالات ایسے ہیں تو پھر وہ کونسی صورت ہے جس میں ان حقوق کے احترام اور تحفظ کا خاطر خواہ انتظام ہو سکتا ہے۔ اس باب میں مسٹر (MARITAIN) نے اپنے تعارفی مقالہ میں جو کچھ کہا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

پس چہ باید کرد

انسانیت کے حقوق کی تعریف (DEFINITION) نہیں بلکہ روزمرہ کی زندگی میں ان کے استعمال کے مسئلہ پر متفق ہونے کے لئے، سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اقدار کے پیمانوں پر متفق ہوا جائے۔ حقوقِ انسانیت کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے نزدیک، انسانی زندگی کا عملی تصور مشترک ہو۔ اسی کو "فلسفۂ زندگی" کہتے ہیں۔

یعنی احترامِ حقوقِ انسانیت کے لئے ضروری ہے کہ تمام اقوام کا فلسفۂ زندگی (یا آئیڈیالوجی) مشترک ہو۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا تحفظِ حقوقِ انسانیت کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ قرآن کریم اس کو ایمان کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ تمام نوعِ انسان کے لئے اقدار (VALUES) کے یکساں پیمانے مقرر کرتا ہے۔ وہ عالمگیر انسانیت کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۱۰/۵۷)

اے نوعِ انسان! تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے، ایک ضابطہ، ہدایت آگیا ہے۔ اس میں ہر اس نفسیاتی کش مکش کا علاج ہے جو انسانوں کے دل کو وقفِ اضطراب رکھتی اور اس طرح ان کے معاشرہ میں فساد پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔ جو لوگ اس ضابطہ کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں، یہ اُن پر کامیابیوں اور خوشگواریوں کی راہیں کشادہ کر دیتا ہے۔

اس ایمان کی بنیاد اس علیٰ وجہ البصیرت یقین پر ہے کہ انسان (یا اقوام) کے ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے متعین ہوتا ہے، اور اسی کے مطابق اقوام کی موت اور حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔

جو قومیں حقوقِ انسانیت کا احترام اور تحفظ نہیں کرتیں، وہ تباہ و برباد ہو کر رہ جاتی ہیں، اور ان کا عسکری ساز و سامان، اور سیاسی مہربانیاں، انہیں اس تباہی سے بچا نہیں سکتیں۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جو نہ کبھی کسی کی خاطر، بدلا ہے، نہ بدلے گا۔ یہی وہ ایمان (یا فلسفۂ زندگی) ہے جس سے حقوقِ انسانیت کا تحفظ ہو سکتا ہے ـــــ اسی ایمان کو ایک زندہ حقیقت بنانے اور اسے عملی پیکر میں لانے کے لئے، ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا، تاکہ اس آزاد مملکت میں انسانی حقوق کا تحفظ ہو سکے۔

پاکستان کی ضرورت

اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ان حقوق کا تحفظ ہے، بلکہ اس کی ہستی کی وجہِ جواز ہی یہ ہے۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے طلوعِ اسلام نے تحریکِ پاکستان کی اس شدّ و مد سے حمایت کی تھی، اور یہی وہ نصب العین جس کی طرف یہ تشکیلِ پاکستان سے لے کر اس وقت تک مسلسل دعوت دیئے چلا آ رہا ہے۔ یہ مقصدِ عظیم اس وقت حاصل ہوگا جب اس خطۂ زمین میں، قرآنی نظامِ زندگی قائم ہوگا کہ وہی نظام، احترامِ آدمیت کا ضامن اور حقوقِ انسانیت کا محافظ ہو سکتا ہے۔

حرفِ آخر

ہم نے اس مقالہ میں صرف حقوق کا ذکر کیا ہے (کہ اس کا موضوع یہی تھا)۔ ذمہ داریوں کا ذکر نہیں کیا۔ حقوق مطلق کو چھوڑ کر جس قدر حقوق ہیں وہ مشروط ہوتے ہیں، ذمہ داریوں کے ساتھ۔ بالفاظ صحیح یوں کہیئے کہ ہر حق، ایک ذمہ داری کی بجا آوری سے ثبت ہوتا ہے۔ اسلامی نظام میں دو گروہ آباد ہوں گے۔ ایک جماعتِ مومنین جو اس نظام کے قیام و استحکام کی ذمہ دار ہوگی۔ اس کی ذمہ داریاں بڑی اہم اور وسیع ہوں گی۔ ان کا اجمالی سا تصور اس میثاق کی رُو سے سامنے آ سکتا ہے جسے شروع میں بیان کیا جا چکا ہے ـــــ یعنی جان اور مال کا فروخت کر دینا ـــــ ان کے حقوق، ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ دوسرا گروہ غیر مسلموں (اہل الذمہ) کا ہوگا۔ ان کی ذمہ داریاں مملکت کے آئین و قوانین کی رُو سے متعیّن ہوں گی۔ لیکن یہ آئین و قوانین بھی چونکہ ان حدود کے پابند ہوں گے جو خدا کی مقرر کردہ اور غیر متبدّل و معلوم ہیں، اس لئے ان غیر مسلموں کو اپنی ذمہ داریوں اور حقوق کی طرف سے پورا پورا اطمینان ہوگا۔ (جیسا کہ کہا جا چکا ہے) اگر وہ کسی وقت اس نظام کے تابع نہ رہنا چاہیں تو وہ کسی دوسری جگہ جا سکتے ہیں۔ (قرآن کی رُو سے) اس نظام کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ان کے مامن تک انہیں بحفاظت پہنچا دیں۔

للہ الحمد کہ پرویز صاحب کی تازہ ترین تصنیف ـــــ قرآنی قوانین ـــــ ملک میں بے حد مقبول ہو رہی ہے اور اس کی افادیت نکھر کر سامنے آ رہی ہے۔ اس سے نظر آتا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن جلد ختم ہو جائے گا۔ اگر آپ نے اسے ابھی تک حاصل نہیں کیا تو جلدی منگوا لیجئے۔

قیمت فی جلد (مجلد) ۲۰/- روپے (علاوہ محصول ڈاک)

بنا کے تقدیر کا بہانہ ......!

علامہ حمید الدین فراہیؒ ہمارے دور کے ان ممتاز علماء میں سے ہیں جنہوں نے قرآن فہمی کی صحیح طرح ڈالی۔ قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے محاورۂ عرب لاینفک ہے۔ محاورۂ عرب سے مراد یہ ہے کہ قرآنی الفاظ (مفردات) کے وہ معانی لئے جائیں جو زمانہ نزول قرآن کے عرب مخاطبین لیتے تھے۔ یہ طریق تحقیق عربی ادب پر وسیع اور گہری نگاہ رکھنے کے علاوہ بڑا مشکل اور محنت طلب تھا۔ کیونکہ اس کا ذریعۂ تحقیق عرب جاہلیہ کے شعراء کا کلام تھا۔ علامہ فراہیؒ نے اس دشوار گذار راستہ میں قدم رکھا لیکن افسوس ہے کہ وہ تھوڑا سا راستہ ہی طے کرنے پائے تھے کہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اگر وہ اس مقصد کو تکمیل تک پہنچا جاتے تو قرآن فہمی کا راستہ بڑا آسان ہو جاتا۔

ان کے تلامذہ میں سرفہرست (مولانا) امین احسن اصلاحی کا نام آتا ہے۔ لیکن وہ ان کے مدرسہ (واقع سرائے میر، ضلع اعظم گڑھ۔ یو۔ پی) کو چھوڑ کر پنجاب کی طرف تشریف لے آئے اور جماعت اسلامی کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ اس جماعت کے زعماء میں مودودی صاحب (مرحوم) کے بعد انہی کا نام سرفہرست ہوتا تھا۔ ۱۹۵۶-۵۷ء میں وہ، اس جماعت کے دیگر بلند پایہ ارکان کے ساتھ، یہ کہہ کر جماعت سے الگ ہو گئے کہ

میں نے سولہ سال کے بعد ایک گم کردہ راہ قافلہ کا ساتھ چھوڑا ہے۔
(نوائے وقت۔ مورخہ ۵۸/۱/۲۰)

ہم نے اسی زمانہ میں لکھا تھا کہ انہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ جس قافلہ کے ساتھ وہ راہ نورد ہیں، وہ گم کردہ راہ ہے، کافی لمبا عرصہ لگا!

جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد وہ کچھ عرصہ، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ہمنوا رہے (شاید اس قدر مشترک کی بنا پر کہ وہ بھی جماعت کا ساتھ چھوڑنے والوں میں سے تھے) ڈاکٹر صاحب سے علیحدگی کے بعد وہ (غالباً) گوشہ نشین سے ہو گئے اور اب معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے اسی عرصہ میں قرآن مجید کی تفسیر مکمل کر لی ہے جو تدبر قرآن کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ ہمیں اس کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

تفسیر کی تکمیل کے بعد مولانا صاحب نے ایک ادارہ کی بنیاد رکھی ہے جس کا نام "ادارہ تدبر قرآن و حدیث" ہے۔ اس کے مقاصد میں (ادارہ کے الفاظ میں) یہ بھی ہے کہ "قرآن کی طرح حدیث پر بھی ایسا تحقیقی

کام جو حدیث و قرآن اور فقہ اسلامی میں ایسی کامل ہم آہنگی واضح کر دے کہ گروہی تعصبات اور فرقہ وارانہ تعصبات کالعدم ہو جائیں۔ اس ادارہ کی طرف سے تدبّر ہی کے نام سے ایک ماہنامہ کا بھی اجرا ہوا ہے، جس کا پہلا شمارہ ہمیں تبصرہ کے لئے موصول ہوا ہے۔ اس ادارہ میں حدیث پر جس انداز سے تحقیقاتی کام کیا جائے گا اس کا آغاز زیرِ نظر پرچہ سے کر دیا گیا ہے۔ اس کا ذکر ہم ذرا تفصیل سے کریں گے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم اس موضوع کو سامنے لائیں، بغرضِ تفہیم ایک تمہید ضروری سمجھتے ہیں۔

دین کی ساری عمارت قانونِ مکافاتِ عمل کی بنیادوں پر استوار۔ اس قانون سے مراد یہ ہے کہ

(۱) خدا نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا۔

(۲) حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے (بذریعہ وحی) اسے غلط اور صحیح (خیر و شر کے) دونوں راستے دکھا دیئے۔ اور

(۳) اس سے کہہ دیا کہ وہ ان میں سے جو نسا راستہ چاہے اختیار کر لے۔

(۴) اگر وہ شر (برائی کا تخریبی راستہ) اختیار کرے گا تو اس کے تخریبی نتائج اس کے سامنے آجائیں گے (اسے سزا یا عذاب کہا جائے گا) اگر خیر (بھلائی کا تعمیری راستہ) اختیار کرے گا تو تعمیری نتائج کی خوشگوار یوں سے بہرہ یاب ہوگا۔ (اسے حسنِ عمل کی جزا کہتے ہیں)۔

سلسلہ رشد و ہدایت۔ انبیاء کرام کی بعثت۔ نزولِ وحی، یہ سب اسی مقصد کے حصول کے لئے ہے کہ ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ (جزا یا سزا) مل جائے۔ اس میں کسی کی استثنا نہیں۔ حتیٰ کہ خود نبی اکرمؐ نے بھی (وحی کی رو سے قرآن میں) اعلان فرمایا کہ اگر میں بھی (بفرضِ محال) احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کے مؤاخذہ سے نہیں بچ سکتا۔ ذمہ داری کا یہی احساس تھا جس سے صحابہ کبارؓ (بالخصوص حضرات خلفائے راشدینؓ) کانپتے اور لرزتے رہتے تھے کہ کہیں کوئی ایسی لغزش نہ ہو جائے جس سے وہ مؤاخذہ خداوندی کی گرفت میں آجائیں۔ اس لئے وہ اُمّت کو دعوت دیا کرتے تھے کہ وہ اُن کے کردار پر گہری اور کڑی نظر رکھیں اور جہاں کوئی ذرا سی لغزش بھی محسوس کریں انہیں برملا ٹوک دیں تاکہ وہ اپنی اصلاح کر لیں۔

یہ تھا صدرِ اوّل میں قرآنی قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان کا نتیجہ۔

(۰)

صدرِ اوّل کے بعد، خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہو گئی اور دین کا نقشہ (ہی نہیں حلیہ تک) بدل گیا۔ اسلام میں خلیفہ اس سربراہِ مملکت کا نام تھا جسے اُمّت، اس عظیم ذمہ داری کو سرانجام دینے کے لئے متعین کرتی تھی۔ اس اعتبار سے وہ سب سے پہلے اپنے ہر عمل اور فیصلہ کے لئے اُمّت کے سامنے جواب دہ ہوتا تھا۔ اور اس جواب دہی کو اس لئے ضروری سمجھتا تھا کہ وہ قانونِ مکافاتِ عمل کے مؤاخذہ سے بچ جائے۔ ملوکیت میں ہر شخص جو قوّت فراہم کر لے، اُمّت کے کندھوں پر سوار ہو جاتا تھا اور جب تک اس کی قوّت برقرار رہتی، وہ اور اس کے بعد اس کی اولاد تختِ حکومت پر قابض رہتی۔ قانونِ مکافاتِ عمل کا اسے خیال تک

نہیں آتا تھا ——— اگر اسے اس کا خیال ہوتا تو وہ اس طرح اقتدار پر قابض کیسے ہو جاتا۔ قوت کے زور پر صاحبِ اقتدار بن جانے کو تو خدا کا قانون سنگین ترین جرم قرار دیتا ہے۔ یوں نظامِ حکومت سے اُمّت کا عمل دخل ختم ہو گیا۔ اُمّت محکوم ہو گئی اور خلیفہ (بادشاہ) حاکم۔ اور حاکم بھی مطلق العنان۔

جب قانونِ مکافاتِ عمل کا احساس جاتا رہا، تو پھر بادشاہ ہر قسم کی من مانی کرتا ——— سلب و نہب۔ لوٹ کھسوٹ۔ ظلم و استبداد۔ اُمّت کے حقوق کی پامالی۔ اس کا معمول زندگی بن جاتا۔ وہ، وہ اپنی مطلق العنانی کے زور پر یہ کچھ کرتا تو رہتا لیکن یہ خیال اُسے ضرور ستاتا کہ اگر ان مظالم سے تنگ آکر کسی دن قوم اس کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئی تو اس سیلاب کا روکنا ناممکن ہوگا۔ وہ اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا۔ جب اس خطرہ کا احساس زیادہ نزاکت اختیار کر گیا تو (جیسا کہ ہوتا چلا آرہا ہے) مذہبی پیشوائیت آگے بڑھی۔ اس نے سلاطین سے کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ قوم مذہب پرست واقع ہوئی ہے۔ اسے مذہب کے حربوں سے ایسا مفلوج کیا جا سکتا ہے کہ یہ اٹھنا تو درکنار، ہلنے تک کے قابل بھی نہ رہے۔ اس کے لئے انہوں نے اس عقیدہ کو عام کیا کہ تمام کائنات خدائے مطلق کے حیطۂ اقتدار میں ہے۔ یہاں ایک پتّا بھی اس کے حکم کے بغیر ہل نہیں سکتا۔ جو کچھ ہوتا ہے سب اس کے حکم اور اجازت سے ہوتا ہے۔ انسان کا غلط قدم اٹھانا تو درکنار، وہ آنکھ تک بھی اس کے حکم بغیر نہیں جھپک سکتا۔ انسان مجبورِ محض ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے سلاطین کی مطلق العنانیت (ڈکٹیٹرشپ) کے مسلک کی تائید اس آیتِ قرآنی کی غلط تاویل سے کی کہ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ ..... (۳/۲۵) "حکومت خدا کی طرف سے عطا کردہ ہوتی ہے وہ جسے چاہتا ہے حکومت عطا کر دیتا ہے، جس سے چاہتا ہے حکومت چھین لیتا ہے" اس ایک عقیدہ سے حکومت سے قوم کا عمل دخل ختم ہو گیا۔ کسی نے خلیفہ سے کچھ کہنے کی جرأت کی تو اس کا جواب موجود تھا کہ مجھے حکومت خدا نے دی ہے۔ تم اس پر اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہو؟ تم خدا کے فیصلے کے خلاف سرکشی کرنا چاہتے ہو؟ یہ کفر ہے۔ ارتداد ہے۔ اس کی سزا موت ہے۔

ملوکیت کی ڈکٹیٹرشپ میں ہوتا یہ ہے کہ آج جسے جی چاہتا، مسندِ عالیہ پر سرفراز کر دیا۔ کل ہی اسے حوالۂ دار و رسن کر دیا۔ نہ اس ترقی و ارتفاع کے لئے کسی دلیل کی ضرورت۔ نہ اس تذلیل و تعذیب کے لئے سبب بتانے کی حاجت۔

اس بیکسر دھاندلی کے حق میں یہ "خدائی سند" پیش کر دی کہ تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ ..... (۳/۲۵) عزّت اور ذلّت، سب خدا کے ہاتھ میں ہے۔ بادشاہ (بیچارہ) تو محض خدا کا آلۂ کار (INSTRUMENT) ہے۔ خدا جیسا حکم دیتا ہے یہ اس کی تعمیل کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے خلاف کسی قسم کا احتجاج کیا؟ وجہ پوچھنی ہے تو پتھر مارنے والے سے پوچھو۔ پتھر بیچارہ کیا بتا سکے گا؟

عوام بھوکوں مرنے لگے۔ افلاس اور غریبی نے انہیں ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کر رکھ دیا۔ اس کے برعکس وہ

دیکھئے کہ ان کے بچوں کو وہ کچھ نہیں ملتا جو کچھ طبقہ امراء کے کتوں کو ملتا ہے۔ اس سے اُن کے دلوں میں سرکشی کے جذبات کا اُبھر آنا فطری تھا۔ اسے یہ کہہ کر دبا دیا گیا کہ رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ وہ جسے چاہے فقیر بنا دے۔ جسے چاہے امیر۔ اس کے فیصلے کے خلاف کسی کو دم مارنے کی جا نہیں۔

اس طرح ان مستبد جلاّدوں کے ہر حکم اور ہر فیصلہ کے لئے خدائی سند عطا ہو گئی اور ان کے مظالم اور سفاکیت کی کوئی ذمہ داری ان پر عائد نہ ہونے پائی۔

(۷)

آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ قانونِ مکافاتِ عمل سے متعلق قرآنِ کریم کی اس قدر واضح اور مفصل تعلیم اور احکام کے خلاف، ان عقائد نے بار کیسے پا لیا جن سے دین کی بنیاد ہی منہدم ہو گئی۔ اس کے لئے وہی طریق اختیار کیا گیا جو ہر غیر قرآنی عقیدہ و مسلک کو اسلامی قرار دینے کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔ یعنی اس کی تائید میں روایات وضع کی گئیں اور انہیں منسوب کر دیا گیا حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس کی طرف۔ یہ روایات کثیر التعداد ہیں۔ ہم ان میں سے معدودے چند درج ذیل کرتے ہیں۔ (جو احادیث کے نہایت قابلِ اعتماد مجموعہ مشکوٰۃ کے باب القدر سے اخذ کی گئی ہیں) ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے۔ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ خداوند تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو پیدا کرنے سے، پچاس ہزار برس پہلے، مخلوقات کی تقدیروں کو لکھا ہے۔ جبکہ اس کا عرش پانی پر تھا۔ (بحوالہ مسلم)

(۲) حضرت ابنِ عمرؓ کہتے ہیں کہ فرمایا رسولِ خدا نے ہر چیز تقدیر پر موقوف ہے یہاں تک کہ نادانی اور دانائی بھی۔ (بحوالہ مسلم)

(۳) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جس کا ٹھکانا نہ لکھا گیا ہو۔ یعنی یا تو اس کا ٹھکانا آگ میں ہوگا یا جنت میں۔ (بحوالہ بخاری و مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے انسان کی تقدیر میں زنا کا جتنا حصہ لکھ دیا ہے وہ ضرور اس پر عمل کرے گا۔ (بحوالہ بخاری و مسلم) نیز حضورؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا۔ پھر اس کی پشت پر اپنا داہنا ہاتھ پھیرا۔ پھر اس میں سے (یعنی اس کی پشت میں سے) اس کی اولاد نکالی، اور فرمایا۔ پیدا کیا میں نے ان کو جنت کے لئے۔ یہ جنتیوں کے کام کریں گے۔ پھر دوبارہ آدم کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اس سے اور اولاد نکالی۔ اور پھر فرمایا کہ۔۔۔ پیدا کیا میں نے ان کو دوزخ کے لئے۔ یہ لوگ دوزخیوں کے کام کریں گے۔ رسول اللہؐ کا یہ ارشاد سن کر ایک شخص نے عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ پھر عمل کرنے سے کیا فائدہ؟ رسول اللہؐ نے جواب میں فرمایا کہ خداوند تعالیٰ۔۔۔۔ جب کسی بندے کو جنت کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے جنتیوں ہی کے کام کراتا ہے۔۔۔۔۔ اور خدا اس کے ان اعمال کے سبب اس کو جنت میں داخل کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب کسی بندے کو دوزخ کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے دوزخیوں کے کام کراتا ہے۔۔۔۔۔ اور خدا اس کو اس کے کاموں کے سبب

دوزخ میں داخل کر دیتا ہے۔ (بحوالہ۔ مالک۔ ترمذی۔ ابوداؤد)

(۴) حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسولؐ اللہ باہر تشریف لائے اور آپ کے ہاتھوں میں دو کتابیں تھیں۔ آپ نے ہم لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ تم جانتے ہو یہ دونوں کتابیں کیسی ہیں؟ ہم نے عرض کیا، یا رسول اللہؐ! ہم کو معلوم نہیں۔ آپؐ نے سیدھے ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ یہ کتاب پروردگارِ عالم کی طرف سے ہے۔ اس میں جنتیوں کے نام ہیں..... اب نہ اس میں کچھ گھٹایا جا سکتا ہے نہ بڑھایا۔ اس کے بعد آپؐ نے اُلٹے ہاتھ کی کتاب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ یہ کتاب بھی پروردگارِ عالم کی طرف سے ہے۔ اس میں دوزخیوں کے نام درج ہیں۔ اب اس میں نہ کچھ زیادہ کیا جا سکتا ہے نہ کم۔

(بحوالہ۔ ترمذی)

(۵) حضرت ابوالدرداؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ خداوند تعالیٰ نے اپنے ہر ایک بندے کے متعلق پانچ باتوں سے فراغت حاصل کر لی ہے۔ یعنی ان پانچ باتوں کو اس کی تقدیر میں لکھ دیا ہے۔ اس کی مدت (عمر) اس کا نیک و بد عمل۔ اس کے رہنے کی جگہ۔ اس کی واپسی اور رزق۔ (بحوالہ احمد)

اس کی بے شمار روایات کتبِ احادیث میں مروی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جو شخص ان روایات پر قرآن کریم اور علم و بصیرت کی رُو سے غور کرے گا، اس کے دل میں قسم قسم کے شکوک و شبہات پیدا ہوں گے اور وہ ان پر اعتراضات کرے گا اور مزید وضاحت کے لئے سوالات بھی کرے گا۔ جن لوگوں نے یہ احادیث وضع کی تھیں انہوں نے، ایسی صورتِ حال سے بچنے کی خاطر پہلے سے انتظام کر رکھا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس قسم کی حدیثیں بھی ساتھ ہی وضع کر دیں تھیں۔ مثلاً حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ تقدیر کے مسئلہ پر پیچھے

ان پر بحث اور گفتگو کی ممانعت

گفتگو کر رہے تھے کہ رسولِ خدا تشریف لے آئے اور ہماری گفتگو کو سن کر آپ کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اتنا سُرخ ہو گیا کہ انار کے دانوں کا پانی آپ کے رخساروں میں نچوڑ دیا گیا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم کو یہی حکم دیا گیا ہے؟ کیا میں تمہارے درمیان اسی لئے بھیجا گیا ہوں۔ تم سے پہلے جو قومیں گذری ہیں جب انہوں نے اس مسئلہ پر مناقشہ کیا تو ان کو ہلاک کر دیا گیا۔ میں تم کو قسم دیتا ہوں اور مکرر قسم دیتا ہوں کہ تم آئندہ اس مسئلہ میں جھگڑا نہ کرو۔ اور کوئی بحث و گفتگو نہ کرنا۔ (بحوالہ ترمذی)

آپ نے غور فرمایا کہ تقدیر کے متعلق خلافِ قرآن روایات وضع کرنے والوں نے کس طرح پیش بندی کر دی۔ انہوں نے کہہ دیا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ تم سے (تقدیر سے متعلق) جو احادیث بیان کی جائیں، تم انہیں آنکھیں بند کر کے تسلیم کر لو۔ جس شخص نے ان کے متعلق کسی قسم کی بحث یا گفتگو کی وہ ہلاک ہو جائے گا۔

ان واضعینِ احادیث نے، اس خیال سے کہ بعد میں لوگ، بحث و تمحیص، یا قرآنی احکام و دلائل پر غور و تدبر سے، کہیں اس عقیدہ سے منحرف نہ ہو جائیں، ایک اور گرہ لگا دی۔ یعنی اس عقیدہ کو جزوِ ایمان بنا دیا۔

کن باتوں کے ماننے سے ایک شخص مسلمان ہو سکتا ہے اور کن امور کے انکار کرنے سے وہ کافر ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے ان کی صراحت کر دی ہے۔ انہیں اجزائے ایمان کہا جاتا ہے اور یہ پانچ ہیں۔ یعنی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ..... (۲/۱۷۷) ۔ اللہ۔ ملائکہ۔ انبیاء۔ کتب اور آخرت پر ایمان۔ دوسری جگہ ہے۔ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۝ (۴/۱۳۶) جس نے انکار کیا اللہ۔ ملائکہ۔ کتب۔ رسل۔ اور یوم آخرت سے وہ دُور کی گمراہی میں جا پڑا ..... سارے قرآن کریم میں ایمان کے یہی پانچ اجزا بتائے گئے ہیں۔

اجزائے ایمان

لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اب کسی شخص کو مسلمان تسلیم کرنے کے لئے اس سے کس قسم کا اقرار لیا جاتا ہے؟ اس سے کہا جاتا ہے (اور) شاید آپ سے بھی یہ کہا گیا ہو) کہ کہو۔

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ۔

میں ایمان لایا اللہ پر۔ اس کے ملائکہ پر۔ اس کی کتابوں پر۔ اس کے رسولوں پر۔ موت کے بعد دوبارہ جی اُٹھنے پر۔ اور اس بات پر کہ نیکی اور بدی۔ برائی اور بھلائی۔ نفع نقصان۔ خیر اور شر، سب خدا کی طرف سے مقدر ہو چکا ہے۔

یعنی ایمان کے پانچ اجزا تو خدا نے مقرر کئے تھے۔ اب اس میں چھٹے جزو کا اضافہ کیا گیا — یعنی تقدیر پر ایمان

چھٹے جزو کا اضافہ، تقدیر پر ایمان

کا اضافہ کیا گیا — اب کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ خدا، ملائکہ، کتب، رُسل اور آخرت کے علاوہ، تقدیر پر بھی ایمان نہ لائے۔ اور یہ اضافہ ہوا روایات کی رُو سے۔ مثلاً

(۱) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ بندہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک ان چار باتوں پر یقین نہ رکھے۔ (۱) اس امر کی شہادت دینا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں خدا کا رسول ہوں۔ مجھ کو خدا نے حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ (۲) موت کو حق جانے۔ (۳) مرنے کے بعد جی اٹھنے کو سچ مانے۔ اور (۴) تقدیر پر ایمان رکھے۔ (بحوالہ ترمذی، ابن ماجہ)

(۲) حضرت ابن دیلمیؓ کہتے ہیں کہ (حضرت) ابن ابی کعب میرے پاس آئے تو میں نے ان سے کہا کہ تقدیر کے متعلق میرے دل میں کچھ شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔ تم کوئی حدیث بیان کرو تاکہ اس کو سُن کر شاید میرے شبہات دُور ہو جائیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر خداوند تعالےٰ آسمان والوں اور زمین والوں کو عذاب میں مبتلا کر دے تو وہ ان پر کسی قسم کا ظلم کرنے والا نہیں ہوگا۔ اور اگر وہ ان پر رحم کرے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے بہرحال بہتر و برتر ہو گی۔ اگر تو احد پہاڑ کے برابر بھی خدا کی راہ میں سونا خرچ کرے تو تیرا یہ عملِ خیر اس وقت تک خدا کے ہاں قبول نہ ہو گا جب تک تو تقدیر پر کامل اعتقاد و ایمان نہ رکھے اور تو اس بات کو اچھی طرح نہ سمجھ لے کہ جو کچھ تجھ کو پہنچا ہے وہ

رُکنے والا اور خطا کرنے والا نہیں تھا۔ (یعنی تجھے اس سے دوچار ہونا تھا)۔ اور جو چیز تجھ کو نہ پہنچنے والی تھی وہ ہرگز ہرگز تجھ کو نہ پہنچتی (یعنی جو کچھ تجھ کو حاصل ہوا وہ تیری سعی کا نتیجہ نہیں بلکہ مقدر میں اسی طرح تھا اور جو چیز تجھ کو نہیں ملی وہ تیری کوشش سے بھی تجھے نہ ملتی، اس لئے کہ تقدیرِ الٰہی یونہی تھی) اگر تو اس اعتقاد کے خلاف اعتقاد رکھے گا (یعنی تقدیرِ الٰہی پر تیرا کامل اعتقاد نہ ہوگا) اور اسی حالت میں تو مر جائے گا تو تو یقیناً دوزخ میں جائے گا۔ ابنِ دیلمیؓ کہتے ہیں کہ ابی ابنِ کعبؓ کا یہ بیان سُن کر میں عبداللہ ابنِ مسعودؓ کے پاس گیا۔ انہوں نے بھی یہی کہا۔ پھر حذیفہ بن الیمان کے پاس گیا۔ انہوں نے بھی ایسا ہی کہا۔ پھر میں زیدؓ ابنِ ثابت کے پاس گیا۔ انہوں نے بھی اسی قسم کی حدیث کو رسول اللہؐ سے روایت کیا۔ (بحوالہ۔ احمد۔ ابوداؤد۔ ابنِ ماجہ)

یوں تقدیر کا یہ نظریہ جسے مجوسیوں، نصرانیوں اور یہودیوں سے مستعار لیا گیا تھا، ہمارے ہاں جزوِ ایمان بن گیا ——— ہمارے مذہبی حلقہ میں اس نظریہ نے کس قدر اہمیت حاصل کر رکھی ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے سیرت النبیؐ پر سلسلہ وار مجلدات، شائع کی ہیں۔ اس سلسلہ کی چوتھی جلد میں انہوں نے عقائد سے بحث کی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے، اللہ، ملائک، کتب، رُسل اور آخرت پر گفتگو کرنے کے بعد "قضا و قدر" کے عنوان سے ایک مستقل باب کا اضافہ کیا ہے۔ اس کی ابتدا وہ یوں کرتے ہیں:۔

سید سلیمان ندوی مرحوم کی تصریح

> اگرچہ قرآنِ پاک میں ایمان کے سلسلہ میں اس کا ذکر کہیں نہیں آیا مگر اس کا اعادہ بار بار قرآن میں اتنی دفعہ ہوا ہے کہ اس کی اہمیت، اس کی مقتضی ہے کہ اس کو بھی ایمانیات کے پہلو میں جگہ دی جائے۔ چنانچہ بعض صحیح حدیثوں میں یہ ایمانیات کی آخری کڑی قرار دی گئی ہے۔ (ص۸۶)

کسی نظریہ کے "جزوِ ایمان" قرار پا جانے کے عملی عواقب کیا ہوتے ہیں۔ آپ آج اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے اس کا اندازہ اس وقت لگ سکتا ہے، جب اقتدار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں ہو۔ ان حضرات کا فتویٰ یہ ہے کہ جو مسلمان، اجزائے ایمان میں کسی جزو کا منکر ہو (یعنی وہ اسے اس طرح نہ مانتا ہو جس طرح یہ حضرات کہیں) وہ مرتد ہو جاتا ہے۔ اور مرتد کی سزا قتل ہے۔ چنانچہ جس زمانے میں ہماری مذہبی پیشوائیت کو اقتدار تھا، مسئلہ تقدیر کے ضمن میں، خونِ مسلم کی جس قدر ارزانی ہوئی، اور جو قتل و غارت گری، اس "فتنہ، ارتداد" کو دبانے کے لئے روا رکھی گئی، اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔[1]

(۰)

ہم نے اس قدر طول طویل تمہید کی ضرورت، مولانا امین احسن اصلاحی کے زیرِ نگرانی شائع ہونے والے ماہنامہ تدبر کے سلسلہ میں سمجھی تھی، جس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس میں حدیث کے متعلق تحقیقاتی مباحث ہوں گے۔ اس تحقیق کی ابتدا جس مقالہ سے کی گئی ہے وہ اس کے ص۲۲ پر "حدیثِ جبریلؑ" کے عنوان سے درج کیا۔ اس کا اردو ترجمہ اس میں یوں دیا گیا ہے:۔

---

[1] ہم نے ان تمام مباحث کو پرویز صاحب کی مایۂ ناز تصنیف "کتاب التقدیر" سے اخذ کیا ہے۔ اس میں مسئلہ تقدیر پر بڑی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

یحییٰ بن یعمر سے روایت ہے کہ بصرہ میں سب سے پہلے جس شخص نے تقدیر کا انکار کیا وہ معبد الجہنی تھا۔ میں اور حمید بن عبدالرحمان الحمیری حج یا عمرہ کے لئے چلے تو ہم نے باہم یہ مشورہ کیا کہ اگر ہمیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں سے کوئی صاحب مل گئے تو اُن سے تقدیر کے متعلق لوگوں کے خیالات کے بارے میں دریافت کرنا مناسب رہے گا۔ چنانچہ جب ہمیں عبداللہ بن عمرؓ، مسجد میں داخل ہوتے نظر آئے تو میں نے اور میرے ساتھی نے انہیں دائیں بائیں سے گھیر لیا۔ مجھے گمان ہوا کہ میرا ساتھی چاہتا ہے کہ بات میں کروں اس لئے میں نے کہا: "ابوعبدالرحمٰن! ہمارے ہاں کچھ ایسے لوگ ظاہر ہوئے ہیں جو قرآن پڑھتے لیکن اس کے علم سے دھینگا مشتی کرتے ہیں۔" میں نے ان کے مزید حالات سے انہیں آگاہ کیا اور بتایا کہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ تقدیر کچھ نہیں اور ہر معاملہ بالکل آغاز سے واقع ہوتا ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ نے کہا: "جب تم ان لوگوں سے ملو تو انہیں بتانا کہ نہ میرا اُن سے کوئی تعلق ہے اور نہ ان کا مجھ سے کوئی تعلق ہے۔ قسم اس ذات کی جس کے نام کی عبداللہ بن عمرؓ قسم کھاتا ہے، اگر ان میں سے کسی کے پاس کوہِ اُحد کی مانند سونا ہو اور وہ اسے (خدا کی راہ میں) خرچ بھی کر دے تو اللہ اس کی عبادت اس وقت تک قبول نہیں کرے گا جب تک وہ تقدیر پر ایمان نہ رکھتا ہوگا۔" پھر انہوں نے حدیث بیان کی کہ

ہم اس مقام پر قصداً رُک گئے ہیں کہ آپ اس حدیث کو ملاحظہ فرمانے کے لئے ذرا تازہ دم ہو لیں۔ تحریر ہے:۔

میرے والد عمرؓ بن الخطاب نے مجھے بتایا کہ ایک دن جب ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجود تھے ناگاہ ایک ایسا شخص نمودار ہوا جس کے کپڑے بالکل سفید اور بال گہرے کالے رنگ کے تھے۔ اس پر سفر کا کوئی اثر دکھائی نہ دیتا تھا اور ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا بھی نہ تھا۔ وہ سیدھا نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے اپنے گھٹنے حضورؐ کے گھٹنوں کے ساتھ جا ٹیکے اور ہاتھ اپنی رانوں پر رکھ لئے اور کہنے لگا: "محمدؐ! مجھے اسلام کے بارے میں بتایئے۔" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اسلام یہ ہے کہ تو یہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، تو نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے، رمضان کے روزے رکھے اور بیت اللہ کا حج کرے اگر اس تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو۔" اس شخص نے کہا: "آپ نے سچ کہا۔" عمرؓ کہتے تھے کہ ہمیں اس شخص پر تعجب ہوا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال بھی کرتا ہے اور آپ کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ اس شخص نے پھر پوچھا: "مجھے ایمان کے بارے میں بتایئے۔" آپ نے فرمایا: "ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر، آخرت کے دن پر اور تقدیر پر یعنی اچھی اور بُری دونوں پر ایمان لائے۔" اس شخص نے کہا کہ "آپ نے سچ کہا۔" پھر پوچھا: "مجھے احسان کی بابت بتایئے۔" حضورؐ نے فرمایا: "احسان یہ ہے کہ

تو اللہ کی عبادت، اس طرح کرے کہ گویا تو اُسے دیکھ رہا ہے کیونکہ اگر تُو نے اسے نہیں دیکھا وہ تو تجھے دیکھ ہی رہا ہے"۔ اس نے کہا۔ "مجھے قیامت کی اطلاع دیجئے"۔ آپؐ نے فرمایا۔" جس سے سوال کیا گیا ہے وہ سوال کرنے والے سے زیادہ کچھ نہیں جانتا"۔ اس نے کہا۔ "مجھے اس کی نشانیاں ہی بتا دیجئے"۔ آپ نے فرمایا۔" نشانی یہ ہے کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنم دے اور تو ننگے پاؤں، ننگے بدن والے، کنگلے ریوڑ چرانے والوں کو دیکھے کہ وہ عمارتوں میں فخر کر رہے ہیں"۔ عمرؓ نے بتایا کہ پھر وہ شخص چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد حضورؐ مجھ سے مخاطب ہوئے اور پوچھا۔" عمرؓ! جانتے ہو سوال کرنے والا کون تھا"۔ میں نے عرض کی۔" اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں"۔ آپؐ نے فرمایا۔" یہ جبریل تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے کے لئے آئے تھے"۔ (صحیح مسلم، کتاب الایمان باب ۔ ما جاء فی الایمان والاسلام وذکر القدر وغیرہ)۔

ظاہر ہے کہ یہ ساری روایت، تقدیر پہ ایمان لانے کے لئے سند کے طور پہ وضع کی گئی ہے۔ تقدیر سے مراد کیا ہے، اس کی بابت اسی ماہنامہ (تدبر) میں اس روایت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

ایمان بالقدر کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اس امر کا یقین رکھے کہ ہر انسان اپنی زندگی میں جس طرح کے حالات، سے دوچار ہوتا ہے، وہ خیر ہوں یا شر، وہ اللہ کے اذن سے ہوتا ہے اور اس کے لئے ایسا ہونا مقدر ہے۔ زندگی اور موت، بیماری اور صحت، رزق کی تنگی اور فراخی، عزت، و ذلت وغیرہ ہر فرد کے لئے پہلے سے طے ہے۔

اب آیئے اس روایت کی طرف۔ روایت وضع کرنے والوں کے متعلق تو کہا نہیں جا سکتا لیکن مولانا اصلاحی جیسے مفسرِ قرآن کی نگاہوں سے تو یہ حقیقت اوجھل نہیں ہونی چاہیئے تھی کہ ملائکہ نظر نہیں آیا کرتے۔ غزوۂ حنین کے سلسلہ میں اللہ تعالٰے نے فرمایا۔ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا۔۔۔ (۹/۲۶) "اس نے مومنین کی مدد کے لئے ایسے لشکر نازل کئے جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے تھے"۔ ذرا آگے چل کر جنگِ بدر کے سلسلہ میں بھی یہی ارشاد ہے کہ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا۔۔۔ (۹/۴۰)۔" اور خدا نے حضورؐ کی ایسے لشکروں سے مدد فرمائی جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے تھے"۔ سورۂ انفال میں ان جنود کو مَلٰٓئِكَةٌ کہہ کر پکارا گیا ہے (۸/۹) نیز سورۂ آلِ عمران میں بھی (۳/۱۲۴)۔ (یہ بحث کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت مریمؑ کی طرف ملائکہ انسانی شکل میں آئے تھے، تفصیل طلب ہے۔ ملائکہ کے معنی قاصد یا پیغام رساں بھی ہوتے ہیں۔ جب قرآن کریم نے بہ نصِ صریح کہہ دیا کہ ملائکہ کو (عام انسان تو ایک طرف خود) صحابہ کبارؓ اور حضور نبی اکرمؐ بھی دیکھ نہیں سکتے تھے (لَّمْ تَرَوْهَا) تو قرآن کے کسی مقام میں بھی یہ معنی نہیں لئے جا سکتے کہ فرشتے (ملائکہ) انسانی پیکر میں سامنے آیا کرتے تھے۔ جبریلِ امین کو تو قرآن کریم نے بالخصوص اَلرُّوْحُ الْاَمِيْنُ (۲۶/۱۹۳) اور رُوْحُ الْقُدُسِ (۱۶/۱۰۲) کہہ کر پکارا ہے۔ بنا بریں، یہ تصور ہی غلط ہے کہ جبریلِ امین ایک انسان کی شکل میں مجلسِ نبویؐ میں آکر بیٹھے تھے۔

وحی یا نبوت کی کنہ و حقیقت سے کوئی غیر از نبی واقف نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا کی

وحیٔ بوساطت حضرت جبریلؑ، نبی اکرمؐ تک کس طرح پہنچتی تھی۔ قرآن کریم نے اتنا ہی بتایا ہے کہ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ... (۲/۹۷) جبریلؑ، باذنِ خداوندی، وحی کو قلبِ نبویؐ پر نازل کیا کرتا تھا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ جبریلؑ حضورؐ کے سامنے آکر فریضۂ پیغام رسانی ادا نہیں کیا کرتا تھا۔ وہ پیغام قلبِ نبویؐ پر القا کیا جاتا تھا۔

پھر اسے بھی پیشِ نظر رکھئے کہ جبریلؑ کا فریضہ خدا کا دین رسول اللہؐ تک پہنچانا تھا، دین سکھانا نہیں تھا۔ وہ تو صرف قاصد (پیغام بر) تھے۔ دین کے معلم نہیں تھے۔ اس روایت میں اسلام کے متعلق جو کچھ پوچھا اور بتایا گیا ہے وہ مسند [illegible] میں موجود ہے۔ اضافہ صرف "تقدیر پر ایمان" کا ہے۔ اور یہی وہ اضافہ ہے جس کی خاطر یہ تمام قصہ وضع کیا گیا۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس خلافِ قرآن عقیدہ (جبر) کی اس وقت کیا ضرورت تھی جو تحقیقِ حدیث کے پروگرام کا آغاز اس [illegible] ہاں جرائم پہلے ہی کچھ کم نہیں۔ اس پر جب یہ عقیدہ عام کر دیا جائے کہ مجرم جس جرم کا ارتکاب کرتا ہے اس کیلئے وہ خود ذمہ دار نہیں [illegible] سب کچھ خدا کے حکم سے ہوتا ہے تو پھر اس سیلاب کو روکنے کی کیا صورت ہوگی؟ اگر کسی مجرم نے عدالت (بلکہ شرعی عدالت) میں اپنی مدافعت میں یہ عذر پیش کر دیا کہ خدا کے حکم کے بغیر تو ایک پتا نہیں ہل سکتا تو میں اس جرم کا ذمہ دار کس طرح قرار پا سکتا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ عدالت اسے قصوروار کس طرح قرار دے سکے گی؟ اور اگر عدالت نے اسے سزا دیدی تو اس کا یہ فیصلہ کتاب و سنت کے خلاف ہوگا۔ اس عقیدہ کی موجودگی میں نہ آئینِ مملکت کی ضرورت رہتی ہے نہ قانونِ حکومت کی۔ نہ پولیس کی ضرورت رہتی ہے نہ عدالتوں کی نہ جیل خانوں کی ضرورت رہتی ہے نہ دار و رسن کی۔ معاشرہ میں انارکی عام ہو جاتی ہے کہ ہر شخص جو کچھ جی میں آئے کرے اور جب اس سے پوچھا جائے تو دھڑلے سے کہہ دے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، خدا کے حکم سے کر رہا ہوں۔ میں اس کی لکھی ہوئی تقدیر کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

لیکن قرآن کو دین کا مدار اور معیار تسلیم کرنے والے اس قسم کی حیلہ سازیوں کے دام فریب میں نہیں آتے جس حضرت عمرؓ کے حوالے سے تدبر میں حدیثِ جبریلؑ نقل کی گئی ہے، اسی (حضرت) عمرؓ کا واقعہ ہے کہ

> ایک چور کو ان کے سامنے لایا گیا تو آپ نے اس سے پوچھا کہ تم نے چوری کیوں کی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ "خدا کا فیصلہ یہی تھا"۔ آپ نے اس پر حد بھی نافذ کردی اور مزید کوڑوں کی سزا بھی دی۔ جب ان سے اس دوہری سزا کی وجہ دریافت کی گئی تو انہوں نے کہا کہ حد تو چوری کے جرم کی سزا ہے اور کوڑے اس لئے کہ اس نے خدا کے خلاف جھوٹا الزام لگایا ہے۔ (ابوزہرہ مصری المذاہب الاسلامیہ اردو ترجمہ ص ۱۳۹)

ہم جناب اصلاحی صاحب کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آپکو موقعہ فراہم کیا ہے تو آپ اس مظلوم قوم کو خدا کی کتاب کی طرف لائیے اور اس جال سے نکالئے جسے ملوکیت نے اپنی ڈکٹیٹر شپ قائم رکھنے کیلئے بنا تھا۔ اگر وہ بھول گئے ہوں تو ہم انہیں خود انکے استادِ محترم کا وہ قول یاد دلا دیں جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ

> یاد رہے کہ احادیث کی اکثریت ضعیف اور اقلیت صحیح ہے ... حدیث، اجماع اور صحفِ اولیٰ تینوں ظن و شبہ سے خالی نہیں ... میں نے بعض روایات دیکھی ہیں جو آیتوں کو جڑ سے اکھاڑ دیتی ہیں ... اکثر اہلِ حدیث کے دلوں میں یہ بات سما گئی ہے کہ بخاری اور مسلم نے جو کچھ روایت کر دیا اس میں شک کی گنجائش نہیں۔ پس ہم بعض قابلِ اعتراض مقامات لکھتے ہیں تاکہ تم سمجھ سکو کہ اللہ تعالیٰ نے علماء کو ذب ٹھہرانے کی شفاعت فرمائی ہے۔ ہم ان کے غیر معقول فکر و فہم پر ایمان لانے کے لئے تیار نہیں۔ (نظام القرآن)

ہم ایمان لانے کے مکلف صرف خدا کی کتاب پر ہیں۔ وہی دین میں قولِ فیصل اور حرفِ آخر ہے اور وہی روایات کے پرکھنے کا معیار بھی۔

(ن م)

حقائق و عبر

اتباعِ سنت

آپ نے یہ اعتراض اکثر سُنا ہوگا کہ اگر ہم سنت کو نہ مانیں تو نماز کس طرح پڑھیں؟ اس کا جواب تو ان لوگوں کے ذمے ہے جو سنت کو نہیں مانتے۔ ہمارے ذمے نہیں۔ ہم تو اسی طرح نماز پڑھتے ہیں جس طرح ساری امت پڑھتی ہے۔ لیکن اس سوال کا جواب کوئی نہیں دیتا کہ سنت کو مان کر نماز کس طرح پڑھی جائے؟ کیا اس طرح جس طرح شیعہ حضرات پڑھتے ہیں یا اس طرح جیسے سنی پڑھتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کا دعویٰ ہے کہ وہ سنت کے مطابق نماز ادا کرتے ہیں۔ پھر سنیوں میں، اہلِ حدیث کی طرح یا اہلِ فقہ (بالخصوص حنفیوں) کی طرح جن میں ہمیشہ نماز کی جزئیات کے اختلاف پر سر پھٹول ہوتی رہتی ہے۔ ان میں ایک اختلافی مسئلہ یہ بھی ہے کہ رکوع میں جاتے اور سر اٹھاتے وقت، ہاتھ اٹھانے چاہئیں یا نہیں۔

حضور نبی اکرمؐ نے ساری عمر نماز ادا فرمائی۔ ہزارہا صحابہؓ نے حضورؐ کے پیچھے نماز پڑھی۔ لاکھوں نے انہیں نماز پڑھتے دیکھا۔ ظاہر ہے کہ نماز میں محسوس اور مرئی حرکات و سکنات کا ان سب نے بچشم خویش مشاہدہ کیا تھا اور ایک آدھ بار نہیں، عمر بھر کیا تھا۔ اور جس طرح رسول اللہؐ نے کیا تھا اسی طرح یہ خود بھی کرتے ہوں گے ..... رکوع میں جاتے وقت بھی۔ سر اٹھاتے وقت بھی۔

صحابہ کے زمانے سے لے کر اس وقت تک نماز امت میں مسلسل اور بالتواتر چلی آرہی ہے۔ یعنی اس کے تواتر میں ایک دن کا بھی انقطاع (GAP) واقعہ نہیں ہوا۔ بادنیٰ تدبر یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ محسوس حرکات جن میں اس قسم کا تسلسل اور تواتر ہو، ان میں کسی قسم کے اختلافات کا سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن ہمارے ہاں صورت یہ ہے کہ نماز کی محسوس حرکات میں بھی اس قدر اختلافات ہیں کہ ان کے سلجھنے کی کوئی صورت نہ آج تک پیدا ہو سکی ہے نہ پیدا ہو سکے گی۔ مذکورہ صدر اختلافات سے متعلق بحث کی کمیت کا کیا عالم ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ کراچی کے ماہنامہ البلاغ کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۸۱ء میں جس کے مدیر مولانا محمد تقی عثمانی ہیں، حافظ حبیب اللہ ڈیروی صاحب کی ایک کتاب پر تبصرہ شائع ہوا ہے۔ کتاب کا نام ہے "نور الصباح فی ترکِ رفع الیدین بعد الافتتاح" اور اس کا حجم ہے ۴۴۲ صفحات۔ اس میں رکوع میں ہاتھ اٹھانے کے مسئلہ پر بحث کی گئی ہے۔ لیکن بحث اس سے بھی مکمل نہیں ہوئی کیونکہ کتاب کے پیش لفظ میں کہا گیا ہے کہ "یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ کتاب اس مسئلہ پر حرفِ آخر ہے"۔ یعنی کتاب کے قریب اڑھائی سو صفحات میں بھی یہ طے نہیں پا سکا کہ اس باب میں سنتِ رسول اللہؐ کیا ہے۔ تبصرہ میں کہا گیا ہے کہ

> یہ مسئلہ آنحضرتؐ اور صحابہ کرام کے زمانہ مبارک سے تاہنوز مختلف فیہ چلا آرہا ہے اور امت مسلمہ میں کہیں اس کے مثبت اور کہیں منفی پہلو پر عمل ہو رہا ہے۔ (ص ۲۳)

اگر سنت نبویؐ کی (بقول ان کے) کیفیت یہی ہے کہ نماز میں ایک محسوس حرکت کے سلسلہ میں آنحضرتؐ اور صحابہ کرام کے زمانے سے اختلاف چلا آرہا ہے تو اسلامی زندگی کے دیگر شعبوں میں اختلافِ سنت کی جو کیفیت ہوگی (اور ہے) اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

البلاغ نے اس کش مکش سے یہ کہہ کر جان چھڑانے کی کوشش کی ہے کہ

حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ کوئی سنت و بدعت یا مکروہ و واجب کا نہیں بلکہ اولیٰ اور غیر اولیٰ کا ہے اور دونوں فریق اسکے قائل ہیں کہ رفع یدین اور ترک رفع یدین دونوں بلا کراہت جائز ہیں۔ اور رفع یدین کرنے یا نہ کرنے سے نماز میں کوئی کراہت نہیں آتی۔ اس سے زیادہ اس مسئلے کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ (صفحہ ۶۳)

یا للعجب! سوال تصفیہ طلب یہ ہے کہ رفع یدین کرنا سنتِ رسول اللہؐ ہے یا نہ کرنا! اور جواب دیا جاتا ہے کہ اس مسئلہ کو کوئی اہمیت ہی حاصل نہیں۔ یوں بھی ٹھیک ہے اور دوں بھی ٹھیک! سوال یہ نہیں کہ مسئلہ آپ کے نزدیک اہم ہے یا نہیں۔ سوال اتباعِ سنت کا ہے، خواہ مسئلہ کوئی بھی ہو۔ کیا آپ کے نزدیک اتباعِ سنت کا تقاضا یہ نہیں کہ یہ عمل اسی طرح کیا جائے جس طرح حضورؐ نے کیا تھا؟

البلاغ کے مدیر مولانا محمد تقی صاحب ہیں جو دفاقی شرعی عدالت کے جج بھی ہیں۔ ان کا فریضۂ منصب یہ ہے کہ وہ طے کریں کہ فلاں معاملہ کتاب و سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ ہم ان سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ فرض کیجئے یہی سوال آپ کے سامنے بحیثیت جج پیش ہو تو آپ سنت کی رُو سے اس کا فیصلہ کیا دیں گے اور اگر اس مسئلہ نے مملکت کے قانون کی حیثیت اختیار کر لی ہو تو آپ سنت کا تعین کس طرح کریں گے جب کہ آپ فرماتے ہیں کہ اس باب میں آنحضرتؐ اور صحابہ کے زمانہ ہی سے اختلاف چلا آرہا ہے۔

یہ اختلاف صرف اسی ایک مسئلہ میں نہیں چلا آرہا، کم و بیش تمام امورِ شریعت میں اسی قسم کا اختلاف موجود ہے اور یہی اختلاف مختلف فرقوں کے وجود کی بنا ہے۔

ان حالات میں سوچئے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ کتاب و سنت کی رُو سے مملکت کا متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب کیا جا سکیگا؟ کیا ہر قانون کی صورت میں سنت کا اختلاف آڑے نہیں آئے گا؟ ان میں سے ہر ایک دل میں اعتراف کرے گا کہ کتاب و سنت کی رو سے فی الواقعہ کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا لیکن اس کا اقرار کرنے کی کوئی جرأت نہیں کرے گا کیونکہ اس سے اس پورے کے پورے طبقہ (مذہبی پیشوائیت) کی سیادت و قیادت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے مومنانہ جرأت کی ضرورت ہے جو اب کہیں نظر نہیں آتی۔ ان حضرات کی اس سعی لاحاصل سے، نہ صرف یہ کہ اس غریب قوم کا وقت، توانائی اور روپیہ ضائع ہو رہا ہے، قوم کا نوجوان طبقہ نفسِ اسلام کی طرف سے سرکش ہوتا جا رہا ہے۔ اور دنیا میں یہ خیال عام ہوتا جا رہا ہے کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے۔ اب یہ زندہ حقیقت نہیں بن سکتا۔ لیکن انہیں اس سے کیا غرض!

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام کشتی کسی کی پار ہو یا درمیان رہے

۲۔ سوال: تھیاکریسی کیا ہوتی ہے؟ عملی مثال سے سمجھائیے۔

جواب: ایک مثال لیجئے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت (فقہ) کا فیصلہ ہے کہ اگر عورت قتل کر دی جائے تو اس کی دیت (خون بہا) مرد مقتول کی دیت سے نصف ہو گی۔ اسے یہ قانونِ شریعت خداوندی سے تعبیر کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ فقہا کا وضع کردہ ہے جنہیں خدائی اختیارات قطعاً حاصل نہیں تھے۔

یہ قانون قرآنی تعلیم و نظام کی اصل اور بنیاد کے خلاف ہے۔ اس نے ہر انسانی جان کو یکساں واجب الاحترام قرار دیا ہے اور اس میں مرد اور عورت میں کوئی تفریق نہیں کی گئی۔ لیکن ان حضرات کا دعویٰ اور مطالبہ ہے کہ اسلامی حکومت میں یہی قانون نافذ ہو گا۔ اس قانون کو منسوخ قرار دینا تو ایک طرف، قوم کی پارلیمان بھی اس میں تبدیلی نہیں کر سکتی۔ ساری امت مل کر بھی اسے چھو نہیں سکتی۔ خود سربراہ مملکت بھی اس میں مداخلت نہیں کر سکتا۔ یہ ابدی طور پر غیر متبدل رہے گا۔

اسے کہتے ہیں تھیاکریسی۔ یعنی انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو نہ صرف خدائی درجہ دینا بلکہ اس سے بھی بالا قرار دینا۔ اس حکومت کو اسلامی تسلیم کرنا جو ان قوانین کو اپنے یہاں نافذ کرے۔ یہاں اسی (تھیاکریسی) کو نافذ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے حالانکہ (علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے واضح اشارات کی رو سے) پاکستان تھیاکریسی کو مٹانے کے لئے وجود میں لایا گیا تھا۔

نظامِ ربوبیت

(یہ پہلے ایڈیشن سے کہیں مختلف ہے)

آپ ایک عرصے سے سنتے چلے آ رہے ہیں کہ اسلام، نہ نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے، نہ کمیونزم کا۔ اس کا اپنا منفرد معاشی نظام ہے جس میں نوعِ انسان کی مشکلات کا حل مضمر ہے۔ لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا؟

مفکرِ قرآن، **پرویز صاحب** کی اس تصنیف میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ:۔

(۱) نظامِ سرمایہ داری کیا ہے؟ کمیونزم اور سوشلزم کے نظام کیا ہیں۔ اور یہ کیوں ناکام رہ گئے ہیں۔

ان کے برعکس

(۲) اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے جو نوعِ انسان کی مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے۔ اس کی روشنی میں یہ بھی بتایا گیا ہے:۔

* مارکس نے کس طرح یہ اعتراف کیا کہ اس کا نظام ناقابلِ عمل ہے۔ * ماؤزے تنگ کا فلسفۂ اضداد کی بنیادیں کس طرح ناستوار ہیں۔
* ربوٰا (سود) کا مسئلہ کیا ہے اور اس کا حل کیا ہے۔ * زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔

اس کتاب کے بعد آپ کو معاشیات کے موضوع پر کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔

کتاب آفسٹ کی چھپائی میں، ولایتی سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے — ضخامت سوا چار سو صفحات — سنہری جلد

قیمت فی جلد پچاس روپے — (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ *

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور ○ مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

سلیم کے نام

پرویز صاحب نے شروع ہی سے، اپنی قرآنی فکر و پیغام کا اوّلیں مخاطب، قوم کے نوجوان، تعلیم یافتہ طبقہ کو قرار دیا ہے کیونکہ (بقول ان کے) اسی طبقہ کے بگڑنے سے قوم بگڑتی ہے اور اسی کے سنورنے سے سنورتی۔ اس طبقہ کے قلب و دماغ میں صحیح انقلاب پیدا کرنے کے لئے انہوں نے ایک سنجیدہ، شگفتہ، دلآویز سلسلہ شروع کیا جسے ــــ "سلیم کے نام خطوط" ــــ سے تعبیر کیا گیا۔ ان خطوط نے فی الواقعہ قوم کے نوجوان طبقہ کی ذہنیت بدل دی۔

اس سلسلہ کے، تین حصے شائع ہوئے تھے لیکن حصہ اوّل، کچھ عرصہ سے نایاب تھا۔ اب اسے دوبارہ شائع کیا گیا ہے جس سے تینوں جلدوں کا سیٹ مکمل ہوگیا ہے۔ پہلے اس سلسلہ کو خطِ نسخ (ٹائپ) میں چھاپا گیا تھا لیکن قارئین کے تقاضوں کے پیشِ نظر، اب اس جلد اوّل کو خوبصورت خطِ نستعلیق میں شائع کیا گیا ہے۔ باقی جلدوں کی اشاعتِ ثانیہ پر بھی یہی اسلوب اختیار کیا جائے گا۔

- جلد اوّل، عمدہ سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔
- بکس بورڈ کی جلد پر ٹائیٹل بڑا جاذبِ نگاہ ہے۔

تقطیع کلاں ۳۰ × ۲۰ ضخامت ۲۶۴ صفحات ــــ قیمت -/۲۵ روپے فی جلد۔

- اب ان تینوں جلدوں کی قیمت حسبِ ذیل ہوگی۔ (محصول ڈاک -/۴ ″)

(علاوہ محصول ڈاک)

- جلد اوّل ــــ -/۲۵ روپے
- جلد دوم ــــ -/۱۵ روپے
- جلد سوم ــــ -/۱۵ روپے

ملنے کا پتہ:

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور ۱۱ (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

جس کتاب کا برسوں سے انتظار تھا۔ وہ

بالآخر شائع ہو گئی۔ (فالحمد للہ)

پرویز صاحب متعارف تو مفکرِ قرآن کی حیثیت سے ہیں، لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ کون کونسی ہوش رُبا وادیوں اور حیرت فروش منزلوں سے گذر کر اس چشمۂ نور و حیات تک پہنچے ہیں۔ ان کا بچپن تصوف کے خواب آور گہوارہ میں گذرا۔ جب ان کے شعور نے آنکھ کھولی تو ان کے دل میں خلش پیدا ہوئی کہ معلوم کیا جائے کہ تصوف کی اصل و بنیاد کیا ہے۔ جسے مشاہدۂ حقیقت کہا جاتا ہے اس کی کُنہ و ماہیت کیا ہے۔ واردات قلبی کا سرچشمہ کونسا ہے۔ مختلف ریاضتوں اور مراقبوں سے جو روحانیت حاصل ہوتی ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ تعویذوں اور گنڈوں میں اثر کیسے پیدا ہوتا ہے۔ کرامات کس طرح سرزد ہوتی ہیں۔ یہ، اور اسی قسم کے سینکڑوں سوالات ان کے سینے میں اُبھرے جن کے حل کی تلاش میں وہ برسوں صوفیائے کرام کی درگاہوں اور خانقاہوں۔ ہندو سادھوؤں کی سمادھیوں اور سنیاسیوں کے یوگ آشرموں میں سرگرداں رہے اور اس طرح جو کچھ پڑھا تھا اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ جو کچھ سنا تھا اس کا ذاتی مشاہدہ کر لیا۔ ان واردات و مکاشفات کا علم و تجربہ حاصل کرنے کے بعد وہ دانشِ نورانی (کتاب اللہ) کے سنگِ آستاں پر سجدہ ریز ہو گئے۔

اب انہوں نے اپنی ان آستاں نوردیوں اور خانقاہ پیمائیوں کی سرگذشت اور خود تصوف کی تاریخ کو اپنے مخصوص دلآویز انداز میں، اپنی تازہ ترین تصنیف۔

تصوّف کی حقیقت

میں منضبط کر دیا ہے۔ اس کے دو حصے ہیں —— اوّل، تصوّف اور اسلام —— دوم، تصوّف اور اقبالؒ —— مستور حقیقتوں کا آئینہ، اور سربستہ رموز و اسرار کا گنجینہ۔ کتابت، طباعت کاغذ عمدہ —— جلد مزیّن اور مطلّا —— ضخامت چار سو صفحات سے زائد۔ قیمت -/۷۵ روپے (محصولڈاک -/۵ ")

ملنے کا پتہ: ——

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲۔ لاہور ۱۱ (۲) مکتبۂ دین و دانش چوک اُردو بازار لاہور

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جسے مقامی بزم ہائے طلوعِ اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ، کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسبِ ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے۔

نوٹ :- پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور ٹیپیں بزموں کے لئے ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف :-
لاہور	جمعہ ۹ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱ بجے دوپہر	149 SUTTON COURT RD. LONDON (F-13-9NR) PHONE-01-552-1517
برمنگھم (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار دو بجے دوپہر	(بمقام) 60, HERICK RD SALTLEY, B8 INT.
اوسلو (ناروے)	ہر ماہ کا پہلا اتوار شام ۶ بجے	(بمقام) MR MANZOOR AHMAD, DOVRE GATE-7/OSLO-1
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFTWOOD AVE. #311, DOWNS VIEW. TORONTO (NORTH YORK) (ONT): M3N-2P3. PHONE (416) 661-2827
کراچی ۲	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	کتب خانہ بزم طلوع اسلام کمرہ ۲۳ ہارون چیمبرز، الطاف حسین روڈ نیو چالی۔ فون ۴۳۸۸۲۸
پشاور	(۱) ہر جمعہ ۵ بجے شام (۲) ہر جمعہ ۹ بجے صبح	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیق لین صدر (OPP. EVIP MAINGATE) پشاور سٹیڈیم ہوسٹل نعمت کدہ۔ یونیورسٹی روڈ۔ جہانگیر آباد۔ فون ۷۲۴۵۹
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف محمود علی صاحب۔ اکاخیل بلڈنگ نواب علی روڈ
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی۔ ۱۶۶ لیاقت روڈ
لیہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر میکینیکل انجینئرنگ ورکس۔ شہید روڈ (لیہ)
ایبٹ آباد	ہر جمعہ ۴ بجے شام	رہائش گاہ صلاح الدین صاحب۔ واقع 234-K-L کہیال (ایبٹ آباد)
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی دکان نمبر ۲۔ نظامی منزل
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ، غنی پورہ باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب۔
چکوال	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	ضیا یونیٹی سنٹر، نزد ہجویری مسجد باہتمام ماسٹر غلام حسین صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام۔
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر جناح روڈ۔ باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	ہر جمعہ ۵ بجے شام	دفتر بزم طلوع۔ رہائشگاہ چوہدری مقبول شوکت۔ گلی روڈ۔ سول لائنز
گجرات	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ و ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر	بمقام ۱/۱۲ بی کشمیر روڈ... باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)
ملتان	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون ... ۳۱۰۷۱)
پنجکسی (تحصیل کبیر والا ملتان)	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	بمقام مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)
ہنگو	ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون نمبر ۲۶)
فیصل آباد	ہر جمعہ ۳ بجے بعد دوپہر	بمقام حیات سرجیکل کلینک ۲۳/سی پیپلز کالونی نمبر ۱ (فون ۴۲۸۵۵)

تحریکِ پاکستان کی کہانی

(قسط سوم)

طلوعِ اسلام کی زبانی

اس کہانی کی پہلی قسط، طلوعِ اسلام کی مارچ ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی اور دوسری قسط مئی ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں۔ اب ..... اس کی تیسری قسط پیشِ خدمت ہے۔

(۰)

جمعیت علمائے ہند

۱۹۴۱ء میں، لیگ کا سالانہ اجلاس، مدراس میں منعقد ہوا۔ اور وہاں پاکستان کے نظریہ کو بنیادی قانون کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔ لیگ نے اب اپنا نصب العین ان الفاظ میں متعین کیا۔

مکمل آزاد ریاست کا استقرار، جو اس طرح متعین کی جائے گی کہ شمال مغرب اور شمال مشرق کے وہ علاقے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، مسلمانوں کے ملی نشیمن ہوں گے۔ ان کی حکومت میں کسی غیر کا عمل و دخل نہ ہوگا۔

پاکستان کا نظریہ، اب آہستہ آہستہ خاورِ جہاں تاب کی درخشندہ شعاعوں کی طرح مطلع سیاستِ ہند پر چھائے جا رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ باطل کی ظلمتناکیاں چپکے چپکے دبے پاؤں پیچھے کو سرکتی جا رہی تھیں اس تذبذب کا آئینہ دار وہ خطبۂ صدارت تھا جو جمعیت علمائے ہند کے اجلاس لاہور کی تقریب پر جناب حسین احمد مدنی صاحب نے ۱۹۴۲ء کے شروع میں ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ میں علاوہ دیگر امور کے اس حقیقت کو اُبھار کر سامنے لایا گیا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو اقلیت تصور کر کے ان کے سیاسی مسائل کا حل نہیں سوچنا چاہیئے بلکہ انہیں ایک قوم کی حیثیت دینی چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا:۔

ہندوستان کے داخلی مسائل میں مسلمانوں کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ گزشتہ ایک صدی سے ہندوستان میں برطانیہ کی حکمتِ عملی نے مسلمانوں کو بھی ہندوستان کی اقلیتوں میں داخل کر کے ان متعلقہ مسائل کو اقلیتوں کے مسائل سے وابستہ کر دیا ہے۔ برطانوی سیاسیین اور بدترین

ہمیشہ مسلمانوں کو ایک سیاسی اقلیت کی صف شمار کرنے اور ان کے معاملے کو اقلیتوں کے معاملات میں شامل کرنے کے عادی ہو گئے ہیں اور اسی بناء پر ہندوستان کی غیر مسلم قومیں بھی ہندوستان کے سیاسی مستقبل میں مسلمانوں کے متعلقہ مسائل کے ساتھ وہی سلوک کر رہی ہیں جو اقلیتوں کے مسائل کے ساتھ کرنے والی ہیں۔ یہ خیال انگریزوں اور غیر مسلموں تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود مسلمانوں کے ایک طبقے کے دلوں میں بھی یہ احساس پیدا ہو گیا کہ وہ ہندوستان میں ایک سیاسی اقلیت ہیں اور اس وجہ سے وہ تمام اندیشے اور وسوسے اور خطرات ان کے دلوں پر چھا گئے جو ایک اقلیت کو اپنی زندگی اور انفرادیت کے متعلق اکثریت کی طرف سے پیش آتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کی مجموعی مردم شماری میں تعداد کے لحاظ سے مسلمان بھی عددی اقلیت میں ہیں۔ لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ بجائے خود ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد یورپ کے کسی بڑے سے بڑے خطے کی آبادی سے کہیں زیادہ ہے۔ نیز ہندوستان کی تعمیر میں ان کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ ہندوستان میں ان کی تعداد نو اور دس کروڑ کے درمیان ہے۔ تہذیب اور ثقافت کے لحاظ سے وہ اہم خصوصیات کے مالک ہیں۔ جغرافیائی حیثیت سے انہیں قدرتی استحکام حاصل ہے۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار میں وہ اکثریت رکھتے ہیں اور اگر صوبوں کی ازسرِنو تجدید اور توسیع کی جائے تو وہ تیرہ مجوزہ صوبوں میں سے چھ صوبوں میں اکثریت حاصل کر لیں گے۔ ان تمام حالات میں بھی اگر مسلمانوں کو ایک سیاسی اقلیت قرار دیکر دیگر اقلیتوں میں انہیں شامل کر دیا جائے تو اس سے زیادہ سیاسی غلطی اور کیا ہو سکتی ہے اور اس سے بڑا اور کیا فریب دنیا کو دیا جا سکتا ہے۔

یہ رجحانات اس حقیقت کے غماز تھے کہ یہ حضرات اب کس طرح اپنے دل کی گہرائیوں میں ملّتِ اسلامیہ کے دعاوی و مطالبات کو حق بجانب محسوس کرتے تھے۔ لیکن ہماری شوریدہ بختی کہ اس کے باوجود انہیں یہ جرأت نصیب نہ ہوئی کہ اس احساس کا کھلے بندوں اعتراف کر لیتے کہ اگر ایسا ہو جاتا تو قوم کی وہ تگ و تاز جو باہمی مخالفت کے مقابلہ میں صرف ہوئی، کسی تعمیری مقصد کے لئے کام آتی اور آج اس کا مقام اس کے موجودہ موقف سے کہیں بلند ہوتا، لیکن ایسا نہ ہوا۔ اور یہ اتنا بڑا نقصان ہے جس کی تلافی ایک مدت میں جا کر ہو سکے گی۔

اسلامی مملکت کی خصوصیت

ان حضرات کا سب سے بڑا اعتراض یہ بھی تھا کہ مسٹر جناحؒ امورِ دین سے واقف نہیں، اس لئے اربابِ مذہب کے نزدیک ان کا پیش کردہ نصب العین درخورِ اعتنا نہیں ہو سکتا۔ اوّل تو اس صغریٰ و کبریٰ کی کڑیوں میں کوئی باہمی ربط نہ تھا۔ دیکھنا تو یہ تھا کہ جو نصب العین پیش کیا جا رہا ہے وہ غیر اسلامی ہے یا دین کے عین مطابق! لیکن انہی دنوں بعض چیزیں ایسی بھی سامنے آگئیں جن سے یہ حقیقت نمایاں ہو گئی کہ مسٹر جناحؒ نے جس نظریہ کو صحیح سمجھا ہے وہ کس طرح دین کے مطابق ہے۔ ۱۹۴۱ء میں مسٹر جناحؒ حیدر آباد تشریف لے گئے تو بعض نوجوانوں نے

ان سے کچھ سوالات کئے۔ یہ مکالمہ شروع ۱۹۴۲ء میں اورینٹ پریس کی وساطت سے اخبارات میں شائع ہوا۔ اسے اپریل ۱۹۴۳ء کے طلوع اسلام میں نقل کیا گیا۔ وہ مکالمہ حسب ذیل ہے:-

"سوال:- مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب:- جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورے کے مطابق میرا ذہن لامحالہ خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مُلّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعوےٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

سوال:- اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت وغیرہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:- اشتراکیت، بالشویکیت، یا دیگر اسی قسم کے سیاسی اور معاشی مسلک دراصل اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ اس میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

سوال:- ترکی حکومت تو ایک سیکولر سٹیٹ ہے۔ کیا اس سے اسلامی حکومت مختلف ہے؟ آپ کا اس باب میں کیا خیال ہے؟

جواب:- ترکی حکومت پر میرے خیال میں، مادی حکومت (SECULAR STATE) کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز، سو یہ بالکل واضح ہے۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کے لئے تعمیل کا مرکز قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ جس نوعیت کی بھی چاہتے ہوں) بہرحال آپ کو علاقہ اور سلطنت کی ضرورت ہے۔

سوال:- وہ سلطنت ہمیں ہند میں کس طرح نصیب ہو سکتی ہے؟

جواب:- مسلم لیگ، اس کی تنظیم، اس کی جدوجہد، اس کا رُخ، اس کی راہ، سب اس سوال کے جواب ہیں۔

سوال:- جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریق کار، دونوں میں بہترین اور برترین حکومت کا

یقین رکھتے ہیں اور اجمالاً یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خود مختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہاں وہ اپنے ذہنی میلانات اور تصوراتِ زندگی کو بلا روک ٹوک بروئے کار لا کر وہ ترقی لا سکیں۔ تو پھر اس میں کونسا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ اپنی جدوجہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کر دے؟

جواب:- (وقت یہ ہے کہ) جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت بغیر اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت، تقسیمِ عمل اور اس کے اصل حدود کیا ہیں، ان امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے۔ اور (اپنے حلقہ سے باہر) اہلیت و مستعدی کے باوجود مجھ میں یا آپ میں (یعنی کسی اور میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجاآوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، انہیں میں ان مولوی صاحبان میں (الا ماشاء اللہ) نہیں پاتا۔ (اور پھر مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ نہیں رکھتے۔"

(۷)

نظریۂ پاکستان

اب پاکستان کا یہ نظریہ عام ہو رہا تھا۔ اِدھر اُدھر سے اس کی تائید میں آوازیں بھی اُٹھ رہی تھیں۔ چنانچہ اوائل ۱۹۴۲ء میں راجگوپال اچاریہ نے اپنا فارمولا پیش کیا جس میں فی الجملہ اس نظریہ کو صحیح تسلیم کیا گیا تھا۔ پھر سر سٹیفورڈ کرپس آئے تو انہوں نے بھی اپنی تجویز میں اس کی طرف رجحان ظاہر کیا۔ لیکن یہ چیزیں صرف ہوا کا رُخ بتا رہی تھیں، کشتیٔ ملت کو ساحلِ مقصود تک پہنچانے کی اہلیت نہیں رکھتی تھیں۔ اس کے لئے ابھی اور جدوجہد اور سعی و کاوش کی ضرورت تھی۔ یہ ہنگامہ اسی طرح سے گرم تھا کہ جنگ کی وجہ سے پیدا شدہ نامساعد حالات ہجوم کر کے اُمنڈ آئے اور طلوعِ اسلام کی اشاعت کا سلسلہ بصد مجبوری معرضِ التوا میں پڑ گیا۔

(۸)

گزشتہ اوراق میں جو کچھ آپ کی نظروں سے گزرا ہے وہ طلوعِ اسلام کے میدانِ سعی و عمل کے صرف ایک گوشے سے متعلق تھا۔ اس سے کہیں اہم وہ دوسرا گوشہ تھا جس کا اجمالی سا خاکہ اب آپ کے لئے وجہِ نورانیت قلب و نگاہ ہوگا۔ گوشۂ اوّل ملتِ اسلامیہ کے اس مطالبہ کی تائید میں تھا جسے نظریۂ پاکستان سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن طلوعِ اسلام کے نزدیک مسلمانوں کا یہ مطالبہ مقصود بالذات نہ تھا بلکہ ایک بلند بالا مقصدِ عظیم القدر کے حصول کا ذریعہ تھا۔ اصل مقصود یہ تھا کہ ہم اپنی زندگی کو قرآنی خطوط پر متشکل کر سکیں اور چونکہ اس کے لئے کسی ایسے خطۂ ارض کا ہونا ضروری تھا جس میں کسی غیر کا دخل نہ ہو، اس لئے پاکستان کا حصول اس کے لئے لابدی تھا۔ اس کے سامنے یہ حقیقت واضح تھی کہ "زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دُنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کی سیرت میں متشکل نہ ہو۔" (اقبالؒ) لہٰذا اس کے لئے ضروری تھا کہ حصولِ خطۂ ارض کی کوششوں کے ساتھ ساتھ نگاہوں کے سامنے وہ خاکہ بھی رکھتے چلے جائیں جس کے مطابق اس خطۂ زمین پر ایک جدید عمارت کی تعمیر ہونی تھی۔ یہ تھا طلوعِ اسلام کی مساعی کا دوسرا گوشہ۔ یوں تو طلوعِ اسلام کی ہر سطر اسی ایک

منزل کی طرف دلیلِ راہ بنتی تھی لیکن اس باب میں اہم مضامین کا ایک مستقل سلسلہ بھی جاری رہا۔ چنانچہ جولائی ۱۹۳۸ء میں جناب پرویز کا ایک حقیقت کشا مضمون جماعتی زندگی شائع ہوا جس سے اس سلسلہ کی ابتدا ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں جناب اسلم جیراجپوری کا مضمون "اسلامی نظام" کے عنوان سے شائع ہوا۔ جس میں قرآنی آئینِ حکومت و سیاستِ مُدن کے بنیادی خط و خال سامنے آگئے۔ نومبر ۱۹۳۸ء میں اس اجمال کی تفصیل میں پرویز صاحب کا مضمون "مرکزیت" کے عنوان سے شائع ہوا۔ فروری ۱۹۳۹ء میں "اسبابِ زوالِ اُمّت" کے موضوع پر علامہ اسلم صاحب کا ایک اہم مضمون شائع ہوا جس میں انہوں نے تاریخ و قرآن کی روشنی میں اس سوال کا جواب دیا جو ایک مدّت سے ہر صاحبِ فکر کی توجہ کو مرکوز کئے ہوئے ہے کہ ؎

ہیں آج کیوں ذلیل جو کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں!

اس باب میں سب سے اہم سوال جو اکثر سامنے آتا ہے، یہی ہوتا ہے کہ قرآن جس قسم کے دولتی نظام کی تشکیل چاہتا ہے اس کے اصول و مبانی کیا ہوں گے۔ اس موضوع پر مئی ۱۹۷۹ء کے طلوعِ اسلام میں جناب پرویز کا مضمون "خدا کی بادشاہت" شائع ہوا جس میں وضاحت سے بتایا گیا کہ دنیا میں قوّت اور دولت کا غلط مصرف فسادِ آدمیت کا باعث ہوتا ہے، اور قرآن جس نظام کو دنیا میں وجہِ اشرفِ انسانیت قرار دیتا ہے اس میں قوّت اور دولت کے غلط استعمال کا شائبہ تک باقی نہیں ہوتا اور احترامِ آدمیت کہ جو درحقیقت سرچشمہ ہے ہر قسم کے شرف و مجد کا، اس نظام کا بنیادی اصول قرار پاتا ہے۔

اسی سوال کا دوسرا حصّہ یہ ہے کہ اس نظام میں غیر مسلموں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے گا۔ یہ سوال تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں خاص اہمیت رکھتا تھا کہ یہاں کی آبادی میں ایک نمایاں حصّہ غیر مسلموں کا تھا۔ چنانچہ اس موضوع پر جون ۱۹۳۹ء کے پرچہ میں "اسلام اور مذہبی رواداری" کے عنوان سے جناب پرویز کا دوسرا اہم مقالہ شائع ہوا جس میں قرآنی نصوص اور تاریخی نظائر و شواہد سے اس حقیقتِ مستور کو بے نقاب کیا گیا کہ قرآنی نظام کے متعلق غیر مسلم مؤرخین نے دنیا کو کس قدر فریب میں مبتلا رکھا ہے اور اس طرح اس کے حسین چہرے کو کس قدر بھیانک عصریتی نقوش میں پیش کیا ہے۔

اکتوبر ۱۹۳۹ء میں پرویز صاحب کا عظیم القدر مضمون "مسلمان کی زندگی" شائع ہوا جس میں انہوں نے اپنے مخصوص دلکشا انداز میں بتایا کہ مسلمان کی حقیقی زندگی کس قسم کی ہوتی ہے۔ اور عجمی تصوّرات اور غیر قرآنی نظریات نے اسے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔

(۱)

اسلام نے جو اجتماعی نظام اُمّت کے لئے تجویز کیا ہے اس کا مرکز کعبہ اور محیط تمام کرۂ ارض ہے۔ لیکن مسلمانوں نے جس طرح کعبہ کے مرکزی اجتماع کو محض ایک "یاترا" کی حیثیت دے رکھی ہے۔ اس نے اس عظیم القدر اور مہتم بالشان نظام کو جسدِ بے روح بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس حقیقتِ کبریٰ کو واضح طور پر سامنے لانے کے لئے دسمبر ۱۹۳۹ء میں علامہ

اسلم جیراجپوری کا ایک پُرمغز مقالہ "حقیقتِ حج" شائع ہوا۔ اس کے بعد جنوری ۱۹۴۰ء کے پرچہ میں جناب پرویز کا مضمون "تمسک بالکتاب" شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ جس طرح مسلمانوں کی تمام حرکت و عمل کا مرکز کعبہ ہے اسی طرح ان کے آئین و ضوابط کا مرکز قرآن ہے۔

لیکن قرآن اسی صورت میں سمجھ میں آسکتا ہے جب اسے تمام انسانی تخیلات سے مبرا رکھا جائے۔ یہ انسانی تخیلات کن کن لطیف راہوں سے قرآن پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور انہوں نے عقیدت و عظمت کی مقدس نقاب اوڑھ کر کس طرح مسلمانوں کے دل کی گہرائیوں میں جگہ پکڑ رکھی ہے، اس کا تجزیہ جناب پرویز کے مبسوط مضمون "شخصیت پرستی" میں کیا گیا جس کی پہلی قسط مارچ ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔ اگست ۱۹۴۰ء میں ان ہی کا ایک اور مضمون "ختمِ نبوت" کے عنوان سے شائع ہوا جس میں "ایک آنے والے" کے مجوسی عقیدہ کی حقیقت کو بے نقاب کیا گیا۔

(۰)

عجمی تصوف کے زیرِ اثر دنیا کے فلسفہ نے جب مسلمانوں کی زندہ اور زندگی بخش دنیا کو قبرستان میں تبدیل کر دیا، تو اُن کے ذہنوں میں نُدرتِ افکار رہی نہ بازوؤں میں قوتِ تخلیق۔ دماغ، تقلیدِ جامد کی برفانی سلوں سے مفلوج ہو گئے اور وہ آہنی پنجے جو پتھروں کے سینہ میں چھپی ہوئی چنگاریوں کو کھینچ کر اپنے قبضۂ قدرت میں لے آیا کرتے تھے، مصروفِ سبحہ شماری ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ان کی حالت یہ ہو گئی کہ دنیا اور اس سے متعلق تمام علوم و فنون کفار کا حصہ قرار پا گئے اور محکومی و محتاجی کی ذلیل زندگی کو "اللہ کی رحمت" قرار دے کر، مسلمان نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کہ آخرت کی تمام سرفرازیاں ہمارا ہی حصہ ہیں۔ اس عجمی افسوں کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے سامنے اس حقیقت کو واضح کیا جائے کہ قرآن نے علومِ طبیعی میں غور و فکر کرنے اور اشیائے کائنات سے نفع اندوز ہونے کی کس قدر تاکید کی ہے، اور جب قرآن کی صحیح تعلیم مسلمانوں کے سامنے تھی تو اس باب میں انہوں نے کس قدر تجسس و کاوش سے کام لیا تھا۔ اس موضوع پر جناب پرویز کا تحقیقاتی مقالہ "اسلام اور سائنس" مارچ ۱۹۴۱ء کے پرچہ میں شائع ہوا۔ اپریل ۱۹۴۱ء میں ان ہی کا ایک اور مضمون بعنوان "فردوسِ گم گشتہ" شائع ہوا جس میں انہوں نے بتایا کہ وہ جنتِ ارضی جس کے ہم کبھی وارث تھے کس طرح ہماری نگاہوں سے گم ہو گئی اور اب اس کی بازیابی کی کیا صورت ہے۔

(۰)

برہمو سماجی تفسیر ہندوؤں کو مسلمانوں سے کسی اور باب میں تو خطرہ نہیں تھا۔ اور جو خطرات تھے ان کے مقابلہ کی تیاریاں وہ ساتھ کے ساتھ کئے جا رہے تھے لیکن ایک میدان ایسا تھا جس میں انہیں ان کی طرف سے خطرہ یقینی تھا اور مشکل بالائے مشکل یہ کہ اس خطرہ کے مقابلہ کا کوئی سامان ان کے پاس موجود نہ تھا۔ یہ میدان مذہب کا تھا۔ انہیں خطرہ تھا کہ اگر مسلمانوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کر دی تو ہندو قوم اس کے مقابلہ میں ایک لمحہ کے لئے بھی ٹھہر نہ سکے گی۔ یہ

خطرہ ان کے لئے ہر وقت باعثِ سوہانِ روح تھا۔ اس کی روک تھام کے لئے "مہاتما" گاندھی نے اس فلسفہ کا پرچار شروع کیا کہ دنیا میں تمام مذاہب یکساں ہیں۔ کسی ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ مطلب واضح ہے کہ اگر ہندومت اتنا بلند نہیں ہو سکتا کہ اسلام کی سطح تک پہنچ جائے تو اسلام کو اس کے مقام سے نیچے اتار کر ہندومت کی سطح پر رکھ دیا جائے۔ لیکن گاندھی جی اس حربہ کے کمزور پہلو سے خوب واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے کہنے سے مسلمانوں پر اس کا اثر کچھ نہیں ہوگا کہ اسلام اور ہندومت ایک جیسے مذہب ہیں۔ اس کمی کو "مولانا" ابوالکلام صاحب آزاد کی برہمو سماجی تفسیر (ترجمان القرآن) نے پورا کر دیا جس میں مختلف انداز سے اس چیز کو ابھارا گیا کہ "عالمگیر صداقتیں تمام مذاہب میں یکساں ہیں"۔ یہ خطرہ بہت دور رس تھا۔ اس لئے کہ جناب آزاد مسلمانوں میں ایک عالمِ قرآن کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے اور ان کے الفاظ کا جادو مسلّم تھا۔ اس سحر سامری کی شکست و ریخت کے لئے جناب پرویز کا مدلل اور مسکت مضمون "کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟" اگست ۱۹۴۱ء کے پرچہ میں شائع ہوا جس نے اس طلسم کی عنکبوتیت کو بے نقاب کر کے رکھ دیا۔

(۰)

اس کے بعد اکتوبر اور دسمبر میں ان کے اور اہم مضامین "نجات کا قرآنی نظریہ" اور "نظریۂ ارتقاء اور قرآن کریم" شائع ہوئے۔ اپریل ۱۹۴۲ء میں ان کا ایک اور مضمون بعنوان "اپنی آنکھ اور قرآن کریم" شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ قرآن کے شمع نورانی پر، غیر اسلامی تصورات کے رنگین فانوس کس کس انداز سے چڑھائے گئے ہیں۔

(۰)

اس مختصر سے تعارف سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہنگامی سیاست پر تنقید و تبصرہ کے ساتھ ساتھ طلوعِ اسلام نے قلب و نگاہ کی صحیح تعمیر کے لئے کیا کچھ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان مضامین میں سے ایک ایک مضمون، اپنی جگہ ایک کتاب کی حیثیت رکھتا تھا ——— ادارۂ طلوعِ اسلام نے اس کا التزام کیا ہے کہ ان تمام مضامین کو الگ کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ کیونکہ ان کی افادیت ہنگامی اور عارضی نہیں مستقل ہے۔

(۰)

اس مقام پر اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی کا ذکر بھی غیر محل نہ ہوگا۔ اگرچہ اس کا تعلق براہِ راست طلوعِ اسلام سے نہیں لیکن بالواسطہ اس سے تعلق ضرور ہے۔ جناب پرویز کے مضامین جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے، درحقیقت ان کے تدبر فی القرآن کے منتشر اجزاء تھے۔ ان کے اس تدبّر کی مستقل صورت وہ عظیم القدر کتاب ہے جو "معارف القرآن" کے نام سے وجہ افروغِ ابصار ہوئی۔ اس کتاب کی پہلی جلد کی اشاعت کا فخر طلوعِ اسلام کو حاصل تھا جو ۱۹۴۱ء میں منصہ شہود پر ہوئی۔ اس کے بعد اس مبسوط اور اہم تصنیف کی دو جلدیں اور شائع ہوئیں اور اب چھٹی جلد کی کتابت ہو رہی ہے۔ اس کتاب کا تفصیلی تعارف کسی دوسری فرصت میں کیا جائے گا۔ اس وقت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ قرآن کی صحیح تعلیم کو سمجھنے کے لئے دنیا کی کسی زبان

ہیں اس کتاب کی نظیر نہیں مل سکتی۔ ہمیں جناب پرویز کی کرم گستری سے امید ہے کہ اس سلسلہ کی بقایا کڑیوں کی اشاعت کا فخر ادارۂ طلوعِ اسلام کو ارزانی فرمایا جائے گا۔

مدار جلوہ در تیغ از دلم کہ خرمن حسن
بہ خوشہ چینیٔ آئینہ کم نمی گردد

(o)

یہ طلوعِ اسلام کا حصہ نثر تھا حصہ نظم ہیں بھی اللہ تعالیٰ نے اس کی خصوصیت کو برقرار رکھنے کا انتظام کر دیا ہے اور اس طرح اس کی تہی دامنی کی لاج رکھ لی۔ طلوعِ اسلام، پیامِ اقبالؒ کے نشر و اشاعت کا ذریعہ تھا۔ اس پیامِ حیات آور کو نظم کے حسین پیکر میں پیش کرنے کا شرف عبدالرفیق نے جناب اسدؔ ملتانی کے لئے مقدر کر رکھا تھا اور جناب اسدؔ کی گہرباریوں کو طلوعِ اسلام کے لئے وقف۔ جناب اسدؔ کی شاعری میں جوش و امید اور بصیرت و ایقان کی وہ تمام خصوصیات موجود ہوتی ہیں جو ایک حقیقی اسلامی شاعر کے کلام میں ہونی چاہئیں۔ — طلوعِ اسلام اپنی خوش بختی پر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے کہ اس کا کوئی شمارہ بھی جناب اسدؔ کی فیض بخشیوں سے محروم نہ رہا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

گذشتہ اوراق میں ان احوال و کوائف کا اجمالی سا تذکرہ آپ کے سامنے آگیا۔ جو ۱۹۳۸ء سے اوائل ۱۹۴۲ء تک مسلمانانِ ہندوستان کی بساطِ سیاست پر رونما ہوئے۔ اور ان کے ساتھ ہی ان مساعی کا مختصر سا تعارف بھی ہو گیا جو اس باب میں طلوعِ اسلام کی طرف سے وجود کوش ہوئیں۔ جون ۱۹۴۲ء کے بعد طلوعِ اسلام کی اشاعت میں التوا ہو گیا۔ اس کے بعد، اس وقت تک جو ایسے اہم واقعات و حوادث ملک میں رونما ہوئے جن سے ملتِ اسلامیہ کی سیاسی زندگی بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہوئی ان کا اجمالی سا تذکرہ آئندہ آپ کے سامنے آجائے گا۔ اور اس طرح آپ کے سیاسی فکر میں وہ تسلسل قائم ہو جائے گا جو مستقبل کے متعلق سوچ بچار کرنے کے لئے ضروری ہے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

(یہ تھا طلوعِ اسلام بابت جنوری۔ فروری ۱۹۴۳ء کے افتتاحیہ کا حصہ اوّل)

۱؎ جناب پرویز کی قرآنی تحقیقات کا یہ سلسلہ درجنوں تصانیف تک پہنچ چکا ہے اور بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ (۱۹۸۱ء)

۲؎ جناب اسدؔ تشکیلِ پاکستان کے بعد مرحوم ہو گئے۔ طوبیٰ لہ وحسن مآب۔

قارئین کے لئے خوشخبری:۔ مطالب الفرقان کی چوتھی جلد پریس میں چھپ رہی ہے۔ (ناظم ادارہ)